گھر سے گھر تک

(افسانے)

احمد ندیمؔ قاسمی

راول کتاب گھر راولپنڈی

تعداد ۱۰۰۰
اشاعت . . . . پہلی بار
سرورق . . . . موجد
ناشر . . . . حمید نغر
مطبع . . . . ہمدرد پریس راولپنڈی
قیمت . . . . چار روپے ۵۰ پیسے

انتساب

چودھری محمد صادق (جہانیاں)

کے نام

جو میرے عزیز دوست ہیں اور مولانا مودودی کے بڑے معتقد ہیں

فہرس

گھر سے گھر تک

حاجی مقتداء احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نورالزماں کی بیوی عشرت خانم، ان کی بیٹی ہما اور بیٹے وقار کا سارا رعب داب صابن کے جھاگ کی طرح فشافش غائب ہوگیا۔ یہ لوگ جس کار میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہوائی اڈے پر کھلے رن وے کے ساتھ کھڑی ہوتی تو لوگ اسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی گلی میں مڑتے ہوئے ڈرائیور کو اسی لئے خاصی دقت ہوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی ہی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا یکایک جی چاہتا تھا کہ اسے چھوتا اور محسوس کرنا چاہیئے مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس ٹھاٹھ کی کار کو چھونا یقیناً خلافِ قانون ہوگا اور پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔

کار حاجی مقتداء احمد کے مکان کے سامنے رکی تو باوردی ڈرائیور

نے اتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم، ہما اور وقار پھولوں میں سے معوزوں کی طرح برآمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تڑاخ پڑاخ بند کئے تو گلی کے اس سرے سے اس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتوں اور آدھی آدھی لٹکتی ہوئی لڑکیوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیں بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مونچھیں مروڑنے لگا۔

حاجی مقتداء احمد کی بیوی نورالنساء نے دروازے پر عشرت خانم ہما اور وقار کا استقبال کیا اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیسٹری کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان حاجی صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو پائدان پر ذرا دیر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ انہوں نے قالین پر قدم رکھا تو ڈگمگا گئیں جیسے پھسلنے سے بچی ہیں۔ پلٹ کر انہوں نے ہما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پائنچوں کو ذرا سا اٹھا کر صوفے کی طرف یوں بڑھیں جیسے تالاب میں اترنے چلی ہیں۔ ہما اور وقار پر بھی کم و بیش یہی عالم گذر گیا۔ نورالنساء نے سلیپر پائدان پر اتار دیئے اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے

پاس کھڑی ہوگئیں۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس پلش میں لپٹے ہوئے ایک مونڈھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نور النساء چونک کر بولیں۔ "اے ہے وقار میاں، یہ کیا کر رہے ہو؟ اے بہن عشرت خانم! اسے سمجھائیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہیں مونڈھے پر ہی ٹک گیا۔ اٹھو بیٹا اٹھو، سوفے کس لیئے رکھے ہیں؟"

عشرت خانم نے وقار سے کہا: "سن رہے ہو میاں، تمہاری خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں؟"

وقار کچھ اس طرح چل کر صوفے کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر زینہ اتر رہا ہے۔

اس کے بعد تکلفات شروع ہوئے۔ تہذیب برتی جانے لگی، موسم کی بوالعجبیوں کا ذکر چلا۔ پھر نور النساء اٹھیں "ہائے میں نے معصومہ کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمہاری خالہ جان آئی ہیں۔"

وقار جو دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پہ رکھے بیٹھا تھا، بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پہ رکھ کر اور ہما کی طرف دیکھتے ہوئے یوں مسکرا جیسے کہہ رہا ہے۔ "دیکھیے باجی، انہیں منع کر دیجئے۔"

ہما کھڑکھڑاتے ہوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور

مسکرا کر بولی۔ "آپ تشریف رکھیئے خالہ جان، معصومہ کو میں لئے آتی ہوں"

نورالنساء فوراً بولیں۔ "نہیں نہیں ہما بیٹی۔ تم بیٹھو۔ میں نوکروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہہ دوں"۔

نورالنساء سلیپر پٹخاتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہما بولی۔ "دیکھا اماں۔ میں نہ کہتی تھی؟"

"اسی لئے تو میں آتی نہیں تھی۔" عشرت خانم بولیں۔ "سمجھ میں نہیں آتا حاجی صاحب نے اتنی بہت سی دولت کہاں سے بٹور رکھی ہے؟"

"غالیچہ دیکھئے جیسے سمندر کا جھاگ ہے" ہما نے ہاتھ بڑھا کر غالیچے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو دیں۔ "پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار کا تو ہوگا۔"

"ایک ہزار کا؟" وقار پہلی بار بولا۔ "کمال کرتی ہیں باجی۔ دس ہزار کہیئے۔"

"آہستہ بولو" ہما نے آہستہ سے کہا۔ "جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمہاری باتیں سن رہا ہے۔"

"دس ہزار کا اگر صرف یہ غالیچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا ساماں ایک لاکھ سے کم کا کیا ہوگا۔" عشرت خانم نے صوفے میں گھوم

کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑائیں۔ "وہ ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے، منہ میں سماتی ہے، جیب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔"

ہما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ چمکتے ہوئے پردے کو چھو کر کہنے لگی۔ "وہ خالص ریشم کے تو پردے ہیں۔" پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک کر بولی "یہ دیکھئے۔ ذرا سی شکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی لہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھئے، یہ دیکھئے۔" ہما نے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔

"اسے رہنے دے۔" عشرت خانم نے سرزنش کی۔ "وہ کیا کر رہی ہے پردہ گر پڑے گا۔" پھر دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے پردے گنتی ہوئی بولیں "ایک دو تین چار پانچ اور چھ۔ اکٹھے چھ پردے ہیں ایک جیسے۔"

"کچھ نہیں تو چھ سو کے تو ہی ہوں گے۔" ہما بولی۔

"لیجئے اور سنیئے" وقار تڑپ اٹھا "باجی تو کمال کر رہی ہیں دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجیے مجھ سے۔"

"صوفہ دیکھئے، بالکل نئے فیشن کا ہے۔" ہما نے تبصرہ جاری رکھا "وہ تپائیوں پر رکھے ہوئے عجائبات دیکھئے۔ وقار مینٹل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے وہ مٹی کا ہے کہ لکڑی کا؟"

وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا۔ مجھے تو کسی قیمتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے شاید عقیق کا ہے۔"

"عقیق کا؟" عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لیے آدھی اٹھ گئیں۔

"بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔" ہما نے جھوم کر کہا۔ "ایسے ٹھاٹھ کہیں نظر نہیں آئے۔"

عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں۔ "اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہوگی۔"

"میں نے تو کہا تھا کہ پہلے دیکھ داکھ لیجئے۔" وقار نے کہا۔

"ہما سے پوچھو۔" عشرت خانم بولیں۔ "مجھے تو یہی گھسیٹے لیے پھر رہی ہے۔"

"تو کیا ہے اماں؟" ہما بولی۔ "اس میں نقصان کونسا ہے۔ اتنا بہت سا جہیز ملے گا۔"

"تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں۔" عشرت خانم اداس ہو گئیں۔ "بتاؤ کیا ملا؟"

"چپ" ہما نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

تینوں یوں سنبھل بیٹھے جیسے ان کی تصویر اترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آرہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشمی پردے

کے ادھر چینی کے برتن بجنے لگے تھے۔

نورالنساء پردہ ہٹا کر بولیں "وہ آجا بیٹی۔ شرمانے کی کونسی بات ہے اپنی خالہ ہیں۔ اپنی باجی ہما ہیں جن سے تو سلیمہ کے ہاں مل چکی ہے سب اپنے ہیں۔ آجا۔"

معصومہ کی صورت میں ریشم اور نائلون کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عشرت خانم اور ہما نے معصومہ کے سر پہ ہاتھ رکھا اور نورالنساء نے معصومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفہ پہ بٹھا دیا۔

معصومہ نے ایک دو بار سر پہ سے کھسکتے ہوئے دوپٹے کو درست کرنے کے لئے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اٹھایا جیسے ذرا تیزی سے اٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بدصورتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہما معصومہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر "جی" یا "جی نہیں" سے زیادہ اسے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار معصومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نورالنساء معصومہ کی سلیقہ مندیوں اور کشیدہ کاریوں کے قصے سناتی رہیں اور عشرت خانم "ماشاءاللہ، ماشاءاللہ" سے جانب دیتی رہیں۔

پھر جب بھٹے کی صاف ستھری شلوار قمیص میں ملبوس ملازم نے اگلے والے کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ سرکایا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہوئے تو عشرت خانم تو جیسے گونگی ہو کر رہ گئیں۔ اتنی بڑی میز پہ بچھے ہوئے منقش پلاسٹک پہ انہیں ایسی کراکری نظر آئی جس کے بارے میں انہوں نے بازار میں سے گزرتے ہوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برتنوں کے لئے دو ہی جگہیں مناسب ہیں۔ دکانوں کے شوکیس یا وزیر و وزراء کی طعام گاہیں۔ مگر یہ تو حاجی مقبول احمد کا گھر تھا جس کے بارے میں ہما نے انہیں بتایا تھا کہ منیاری کی دکان ہے۔ اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ "وہ یہ تو خاصے کھاتے کھلاتے پیتے چھلکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں!" عشرت خانم نے سوچا۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک ریفریجریٹر کی کمی نے ٹھیس پہنچا رکھی تھی یا معصومہ کی انتہا درجے کی شرم و حیا نے۔ معصومہ نے نہ تو بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چھنک چھنک کر چائے بنائی۔ نہ کوئی پلیٹ اٹھا کر دقار تو چھوڑ، ہما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذرا سی بات پہ بڑا سا قہقہہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی نگاہیں اس پہ پڑ جاتیں اور اس کی بھوؤں کے کٹیلے پن اور آنکھوں کے ہوشربا طول و عرض سے لے کر اس کی لمبی

گردن کے مرمریں کا جائزہ لے آتیں، وہ ہما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو ذرا ذرا سا چکھتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر پرچ میں اسے یوں کوئی آواز پیدا کیے بغیر رکھتی رہی جیسے پیالی اور پرچ دونوں گتے سے بنی ہیں۔

"حاجی صاحب جب عدن میں بزنس کرتے تھے" نورالنساء نے بتایا۔ "تو وہ دنیا جہان کے عجائبات اپنے گھر میں بھرتے رہے۔ چھ قسم کے تو چائے کے صرف روسی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ انہوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن کے ملک سے منگائے اور ان کی قیمت جو ادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہوگا۔ ایران سے وہ کسی آدمی کے ہاں سے قالین منگاتے تھے۔ وہ ان سے یوں خط و کتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالینوں کے سوداگر ہیں۔ ایک بار انہیں کھانے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرایا تو ایک دو سال کے اندر ساگوان کی اکٹھی پانچ میزیں جمع کر لیں۔ میں چیخی چلائی تو بجائے اس کے کہ نیلام کر دیتے، اپنے انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آجاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہوگا کہ اگر نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہوگی۔ پھر جب اتنے بڑے بنگلے میں ایک نیا تنکا

تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تو ساری عمر کی کمائی وہیں اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور عرب شیخوں نے آ کر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر بازار لگ گیا۔ معصومہ اس وقت یہی کوئی چار پانچ سال کی ہوگی۔ اسے بھی یاد ہوگا کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر اُمڈ پڑا تھا۔ یاد ہے بیٹی؟"

"جی" معصومہ بولی۔

"اور بہن عشرت خانم"۔ نورالنساء نے کہنا شروع کیا۔ "واپس وطن آ کر ___"

باہر کا دروازہ کھلا اور صاف ستھرے ملازم نے اندر آ کر پوچھا۔

"اور چائے لاؤں بی بی؟"

"لے آؤ۔" نورالنساء فوراً بولیں۔

عشرت خانم اور ہما چلا اٹھیں۔ "نہیں نہیں۔ ابھی رکھی ہے"۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور ملازم بڑے ادب سے وہیں کھڑا رہا۔ سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لئے نورالنساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خانم کی طرف متوجہ ہوئیں مگر فوراً سیدھی ہو بیٹھیں اور بولیں "ضرورت ہوئی تو بلالیں گے۔ جاؤ۔"

ملازم چلا گیا تو نور النساء بولیں۔ ”تو بہن۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ وطن واپس آکر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس کمرے میں بھی جائیے۔ کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ معصومہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں۔ سو یہ سب غریبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آ رہی ہیں وہ ہم دونوں ہی کی دوڑ بھاگ کا نتیجہ ہیں۔ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں۔ انہیں ترتیب سے لگانے کا سلیقہ معصومہ کا ہے۔“

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔“ عشرت خانم بولیں۔

”سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے۔“ ہما بولی۔ ”ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے۔“

وقار اپنے مکان کی چھت پر کھڑا نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آکر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے مگر معصومہ کھڑی رہی اور اسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر نور النساء نے کہا۔ ”ادھر آج میری بیٹی جمیلہ کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ صبح سے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ معصومہ کو اجازت دیجیے کہ جا کر انہیں سنبھالے۔ چائے پینے میں کپڑے سان دیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔“

"ہاں ہاں کیوں نہیں" عشرت خانم بولیں۔

"بس ایک منٹ میں حاضر ہوئی" نورالنساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں، بیٹی اور بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے۔ جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکرا گئے ہیں۔

"اماں جی!" ہمایوں نے دیکھا۔

عشرت خانم ابھی جواب نہیں دے پائی تھیں کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔ "بی بی جی"۔

"کیا بات ہے؟" عشرت خانم جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سن کر بولیں "بس کوئی پانچ منٹ میں۔ زیادہ نہیں۔" ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ عشرت خانم نے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ذرا دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں "تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں اوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نورالنساء کے نواسوں نواسیوں کو ایک ایک روپیہ دے آؤں"۔

"ایک ایک روپیہ؟" ہمایوں بولا "نہیں اماں، دو دو دیجئے گا۔ کیوں دلدار؟"

"اماں کی مرضی ہے" دلدار بولا۔

"دو دو دو دو دو دل گی پر نہ جانے ہیں کتنے؟" عشرت خانم سوچنے لگیں۔
ہما نے بڑی ناگواری سے کہا۔ "اوہ اماں۔ کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں یہ دیکھیے گا دو دو دو۔"

عشرت خانم نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اوپر جانے لگیں۔ سیڑھیوں کے پہلے ہی موڑ پر رک گئیں کیونکہ اوپر سے نورالنساء اُتر رہی تھیں۔ انہوں نے عشرت خانم کو یہاں کھڑے دیکھا تو چلتے چلتے ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر بولیں۔ "اے بہن۔ دیوان خانے میں جا کر بیٹھیے۔ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟"

"یونہی ذرا جی چاہا کہ اوپر سے بھی ہو آؤں۔" عشرت خانم نے مسکرا کر کہا۔ "دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اوپر کے حصے ہی میں ملتا ہے اور میں گھریلو عورت ہوں۔ پھر آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلیے۔ ملا دیجیے ان سے۔"

"میں انہیں نیچے ہی بلائے لیتی ہوں۔" نورالنساء مصر رہیں۔ "ایک تو اوپر بچوں نے دنیا جہان کا کوڑا کباڑ جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے۔"

"تو کیا ہوا؟" عشرت خانم نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور نورالنساء کو بازو سے پکڑ کر کہا۔ "آئیے۔"

"نیچے ہما بیٹی اور وقار بیٹا کیا کہیں گے۔" نورالنساء نے

احتجاج کیا۔

"کچھ نہیں کہیں گے۔" عشرت خانم نے نورالنساء کو کھینچا۔ "میں اُن سے کہہ آئی ہوں کہ میں اوپر جا رہی ہوں۔"

نورالنساء چپ چاپ عشرت خانم کے ساتھ ہو لیں۔

آخری سیڑھی تک پہنچی تھیں کہ معصومہ کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔

"اے کلثوم۔ اس زاہد کے بچے کو پکڑ۔ یہ چائے سے سنے ہوئے ہاتھ لئے میرے کپڑوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہ اسے مدھو لنے چلا ہے۔ سلیمہ کیا کہے گی کہ ـــ"

یکایک نورالنساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آپ کو کس کمرے میں لے جاؤں آج تو یہ یہاں سے وہاں تک بچوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ وہ اٹھا پٹخ مچا لی ہے انہوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے۔" پھر جس طرح انہوں نے یکایک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یکایک رک گئیں اور چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہیں۔

عشرت خانم نے اپنی میزبان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا۔ پھر بولیں۔

"ادھر بچوں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہائے بہن وہاں تو ——" نورالنساء جیسے رونے کے قریب پہنچ گئیں۔ مگر عشرت خانم کو بڑھتا دیکھا تو ان کے ساتھ ہولیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لئے؟" عشرت خانم دروازے کے سامنے جاکر بولیں اور نورالنساء نے قدم روک لئے جیسے اپنی بیٹی سے ان کا پردہ ہے۔

میلی داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپٹے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سرا اٹھاکر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادوائن کا ایک کھٹولا پڑا تھا جس پر معصومہ کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا۔ اور پائنتی کے پاس پانچ چھ برس کا ننگا زاہد کھڑا جائے سے سنی ہوئی انگلیاں چوس رہا تھا۔ اکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش پر مختلف عمروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بھجنگ پتیلی میں تھی۔ چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا تو کسی کے سامنے مرادآبادی کٹورا رکھا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی، ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی تپش سے بچانے کے لئے المونیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس کو اپنی فراک میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا

رکھا تھا کہ اس کا ننھا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلثوم کے سامنے ایک پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جیسے مکھیوں نے سیاہ کر ڈالا تھا۔ وہ ٹرے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ نیلی چیکٹ شلوار اور قمیص پہ ایک چھلنی چھلنی دوپٹہ اوڑھے ننگے پاؤں یوں کھڑی تھی جیسے اُسے چھو لیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی لمبی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے گلابی ہونٹوں پر نیل پڑ رہے تھے۔

عشرت خانم دروازے میں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہیں پھر مسکرا کر نورالنساء کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھیں۔ "اے بہن نورالنساء" وہ پکاریں، جواب نہ پا کر سنجیدہ ہو گئیں اور ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھ گئیں ساتھ والے کمرے سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ نورالنساء جلدی جلدی سے برتن سمیٹ رہی ہیں۔ "بہن" انہوں نے کہا اور نورالنساء سناٹے میں آ گئیں۔ پھر بولیں۔ "یہ باورچی خانہ ہے مگر بچوں نے آج اُسے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ ہائے بہن! مجھے تو ــــــــ"

پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خاموش ہو جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ عشرت خانم ہنس رہی تھیں۔

معصومہ پرلے دروازے میں سے ڈری ڈری جھانک رہی تھی جیسے وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے۔ جس کی ایک۔ دو ہی لمحوں کے اندر مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ٹکر ہونے والی ہے۔

عشرت خانم ہنسے جا رہی تھیں اور اب پیٹ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ "ہائے میرے اللہ" وہ بڑی مشکل سے بولیں۔ "توبہ ہے۔" انہوں نے بڑی محنت سے ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا نورالنساء کے ایک ہاتھ میں پتیلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر تھا اور وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی ہیں۔

عشرت خانم پہ ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ "اے بہن معاف کرنا" وہ بولیں "آپ نے مجھے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ پچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میلی دیواریں اور یہ پرانے دوپٹوں کے پردے آپ نے اوپر کیوں چھپا رکھے تھے؟ یہ ننگے اور ادھ ننگے میلے دھلے بے تحاشے بچے، وہ ٹوٹا ہوا کھٹولا اور یہ سب کنڈے کا تو اے بہن نورالنساء آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو ہٹیے بہن۔" عشرت خانم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "وہ دیکھا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تام چینی کی چوٹ لگی پلیٹیں ہیں جن کے کناروں پہ چنے کی دال اب تک جمی ہوئی ہے۔ ادھر معصومہ بیٹھی

کے مُرست میں جو چارپائی رکھی ہے اس کی ادوائن کو پورا کرنے کے لئے رسی کے ساتھ کسی کا کمربند بھی تو باندھ دیا گیا ہے۔" عشرت خانم نے یہاں رک کر دو تین قہقہے مارے۔ پھر آنکھیں پونچھنے کے لئے اپنے دوپٹے کا پلو پکڑا مگر دوپٹے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ وہ نورالنساء کو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دھند میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ "بہن" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

عشرت خانم باورچی خانے میں داخل ہو کر نورالنساء کے پاس بیٹھ گئیں۔ نورالنساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں میں سے بینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

"دیکھئے بہن۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔" عشرت خانم نے کہا "نیچے سیڑھیوں میں۔ الگ سے۔"

نورالنساء گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سے ٹپاک ٹپاک کی دو تین آوازیں آئیں جیسے تیز ہوا میں خشک ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہوں۔

عشرت خانم منہ میں دوپٹے کا ایک پلو ٹھونسے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر چند سیڑھیاں اتر گئیں۔ پھر رک کر اوپر دیکھا۔ نورالنساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے کے سہارے آہستہ آہستہ اتر

رہی تھیں جب وہ عشرت خانم کے قریب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اتری چلی گئیں۔ مگر عشرت خانم نے انہیں بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ پھر انہیں اپنے مقابل کھڑا کر کے منہ سے دوپٹہ نکالا اور بجائے بولنے کے ہنسنے لگیں۔

"جوتیاں مارئیے بہن عشرت خانم" نورالنساء کی کہیں دور سے آواز آئی۔ "پر یہ جو آپ کی ہنسی ہے"

نورالنساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نورالنساء جھٹک کر تیزی کے ساتھ نیچے اتریں مگر جب تک وہ سیڑھیاں اترتیں ایک لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا "بی بی جی سلام۔ آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہمان چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجئے گا۔ کہتی ہیں قالین اور صوفہ اور پردے بے شک کل تک رکھے رہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی چیزیں ہم آج ہی واپس منگا لیں گے۔ آج سویرے ہمارے ہاں بھی مہمان آ رہے ہیں۔"

نورالنساء آخری سیڑھی پہ جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں انہوں نے صرف گردن کی جنبش سے "اچھا" کہا۔ لڑکا دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نورالنساء آخری سیڑھی پہ جیسے گر پڑیں۔

"ڈرائیور" عشرت خانم نے درست سے پکاریں، "دیوان خانے کا پردہ ہٹا کر ہما نے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں اماں جی۔ کیا ہے؟"
"میں نے ڈرائیور کو بلایا ہے۔ تم اندر بیٹھو" عشرت خانم بولیں
"اور دیکھو۔ صوفے پہ احتیاط سے بیٹھو۔ کپڑوں میں شکن نہ آئے۔ تمہاری سہیلی کیا کہے گی کہ مانگ کر پہنے تو رگڑ دیے اور گنجلا کر واپس کئے۔"

"اماں"۔ ہما کے سینے پہ عشرت خانم نے جیسے مکا مار دیا۔ پھر وہ تیوری کر پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں۔ اس زمانے کی لڑکیاں" عشرت خانم نے نور النساء کے پاس آخری سیڑھی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مانگے کے کپڑے یوں پہنتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دیے ہیں" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ادھر پہلی بار نور النساء کے ہونٹوں پہ ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

"ڈرائیور" عشرت خانم نے اٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں "دیکھو۔ تم کار واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ تانگے سے آ جائیں گے۔ بیگم صاحب کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں۔ اور ہم ایک گھنٹے کے لئے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پہ قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ کہنا بہت بہت شکریہ"۔ پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھا کر

بولیں، "یہ لو۔ تمہارا انعام ہے۔"

ڈرائیور سلام کر کے پلٹ گیا تو عشرت خانم دروازہ بند کر کے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نورالنساء سے لپٹ کر بولیں "اے بہن نورالنساء۔ خدا کے لئے ہنسیے۔ کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جانے تو اپنے ہی گھر جا نکلے۔ اور بہن۔ میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔"

اب نورالنساء کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

باہر کار سٹارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دیا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے کے دروازے پر آیا "اماں جی۔ کار تو جا رہی ہے!"

"جا رہی ہے تو جانے دو۔" عشرت خانم بولیں "کیا یہ تمہارے باپ کی کار ہے؟"

وقار تیورا کر پیچھے ہٹ گیا اور نورالنساء پہلی بار قہقہہ مار کر عشرت خانم سے لپٹ گئیں۔ دونوں کی ہنسی وقار اور سیما کو ایکبار پھر دیوان خانے کے دروازے پہ کھینچ لائی۔ جہاں وہ ریشمی پردہ ہٹا کر بتوں کی سی گول گول حیران حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے

لگے۔ اوپر سیڑھیوں کے پہلے موڑ پہ معصومہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے ڈگری کے نیچے جلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس میں سے کبوتر نکال لیا ہے۔ اور عشرت خانم کہہ رہی تھیں "ہائے بہن نورالنساء میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قسم قرآن مجید کی یسپینہ سرخی پوڈر بہا لے جائے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آ رہا ہے آپ پر۔ آئیے ذرا دیر کو اوپر باورچی خانے کے ننگے فرش پہ جا بیٹھیں۔" ⁂

(جون ۱۹۵۹ء)

ثواب

مسجد میں ادھر صبح کی نماز ختم ہوئی، ادھر نقارہ بجنے لگا۔ اذان سن کر جو لوگ کروٹیں بدلنے لگے تھے، نقارہ سنتے ہی تڑپ کر اُٹھے اور گلیوں میں آ گئے۔

"یا الٰہی خیر" کہہ کر عورتوں نے کھاٹوں پر سے پاؤں لٹکا لیے۔

نقارہ بجے جا رہا تھا اور فضاؤں گونج رہی تھی جیسے نقارے کے بجائے فضا بج رہی ہے ایک مسلسل "تم تم تم" کی آواز جیسے گاؤں کو چاروں طرف سے محاصرے میں لینے کے لئے صبح کے اُجالے کے قدم بہ قدم بڑھی آ رہی تھی۔

"ہائے کس کا گھر اجڑ گیا نور پیر کے وقت؟" عورتوں نے گلیوں میں آ کر پوچھا۔

معلوم ہوا چینگا جھیوہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔

ماں بیٹا دونوں پانی کھینچ رہے تھے کہ بھرا ہوا بوکا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ڈھیر سی رسی جو ان کے آس پاس جمع ہو رہی تھی، بھاری بوکے کے گرنے سے ایک دم کھچی تو خنگے کی ایک ٹانگ رسی کے پھندے میں آ گئی اور وہ اپنی ماں کی آنکھوں کے سامنے چھپاک سے کنوئیں میں گر گیا۔ اسے چیخنے تک کی مہلت نہ ملی۔

”ہائے لٹ گئی بے چاری کرتاں کرماں جلی“ عورتوں نے بآوازِ بلند آہیں بھریں اور چھتوں پر چڑھ گئیں۔ مرد کنوئیں کی طرف بھاگنے لگے۔ نقارہ رک گیا۔ اور عیسیٰ کا سانولا چہرہ زرد پڑنے لگا۔

کرماں کا میاں ہر صبح کو گاؤں کے عقب میں میلوں تک پھیلی ہوئی ڈھلوان کا رخ کرتا۔ جہاں وہ دوپہر تک بھیڑا اور   کی جھاڑیاں اکھیڑتا رہتا۔ یہ سرکاری رکھ تھی اس لیے وہاں کلہاڑی لے جانا منع تھا۔ دوپہر کو وہ آتا تو اس کے سر پر اتنی بہت سی جھانکڑوں کا انبار ہوتا کہ دور سے یوں معلوم ہوتا جیسے ایک گھنا درخت چلا آ رہا ہے۔

کرماں ان جھاڑیوں سے تنور گرم کرتی اور سارے محلے کی روٹیاں پکاتی، بھٹی جلاتی اور بچوں کی پوٹلیوں میں بندھے ہوئے مکئی اور چنے کے دانے بھونتی۔ آٹے اور دانوں ہی سے ذرا ذرا سا بھاڑا لیتی اور یوں میاں بیوی اور بیٹے کا پیٹ پلتا۔

دوپہر کو میاں کے واپس آنے اور تنور کو ٹھنڈا کرنے کے بعد میاں
بیوی دو گدھوں پر چند ریاں لاد کر کھاتے پیتے گھروں سے گھڑے جمع کرتے
اور کنوئیں پر جا کر پانی بھرتے۔ کنوئیں کی جگت پر چار طرف رکھے ہوئے شیشم
اور توت کے تنوں پر رسیوں کے جو لمبے لمبے نشان پڑ گئے تھے ان میں سے
سب سے گہرا نشان انہی میاں بیوی کے بوکے کی رسی کا تھا۔ کیونکہ گاؤں میں
وہ سب سے زیادہ پانی بھرتے تھے۔ ہر پھیرے میں چھ گھڑے گدھے اٹھاتے
دو کریماں کے سر پر ہوتے اور ایک گھڑا اس کا میاں کبھی اپنے سر پر اور کبھی کندھے
پر رکھ لیتا۔ ہر روز دو پھیروں میں اٹھارہ گھڑے بھر کر وہ مہینے میں اٹھارہ
روپے چھتیس آنے کما لیتے اور شاید اسی لئے انہیں اپنے بیٹے کو پڑھانے
کا شوق چرایا۔

وہ کہتے تھے کہ ہم بابر بادشاہ کے زمانے سے پانی بھرتے آ رہے
ہیں۔ اور اب تھک گئے ہیں۔ اب ہمارا چھوکا منشی بنے گا اور اگلی نسل تک
ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ دوسرے لوگ ہمارا پانی بھریں۔

چھوکا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ گھڑوں کا حساب جوڑ لیتا تھا اور
ہر رات سونے سے پہلے ماں باپ کو کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں سناتا تھا تو وہ
ان باتوں کو سمجھے بغیر یہ سوچ کر خوش ہوتے رہتے تھے کہ ان کا بیٹا یہ باتیں
سمجھتا ہے۔

پھر ایک روز جب کرماں کا میاں سرکاری رکھ میں ایک کِکّر پہ چڑھا بیکڑ
ی ایک جھاڑی کو جھٹکے دے دے کر جڑ سے اکھیڑ رہا تھا تو اچانک اس کی توقع سے پہلے ہی جھاڑی اکھڑ آئی ۔ اس کے ساتھ ہی خود اس کے پاؤں بھی اکھڑ گئے ۔ اور کگر سے نیچے ایک چٹان پہ یوں گرا کہ آس پاس اس کے خون اور بھیجے کا چھڑکاؤ ہو گیا۔

بیوہ ہو کر بھی ماں نے چھنگے کو مدرسے سے نہ اٹھوایا۔ البتہ اس نے تنور کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا۔ بھٹی جلانے کے لیے وہ خود ہی کسانوں کے ہاں جا کر تاندوں کھریوں میں سے مڑے تڑے ٹانڈے اور میلا میلا بھوسہ سمیٹ لاتی ، یا پھر ماں بیٹا کنوئیں پہ جاتے اور گاؤں کے کھاتے پیتے گھروں کے لیے پانی بھرتے، بھیڑ سے بچنے کے لیے دونوں منہ اندھیرے سے پانی بھرنا شروع کرتے اور سورج کے نیزہ بھر اونچا ہونے تک فارغ ہو جاتے پھر چھنگا مدرسے کی راہ لیتا اور کرماں بھٹی کے لیے ایندھن سمیٹنے نکل جاتی

اور ابھی کرماں کے میاں کو مرے تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے اور وہ اپنے بیٹے کو ڈول لٹکاتے یا کھینچتے ہوئے رسی سے ہٹ کر کھڑا ہونے کا سلیقہ بھی نہیں سکھا پائی تھی کہ چھنگے کو بجلی کی سی تیزی سے کھلتی ہوئی رسی نے اپنی لپیٹ میں لے کر پہلے تو کنوئیں کے سامنے دھرے تختے پہ پٹخا اور کرماں نہ نہیں کنوئیں کی جگت پہ گر کر بے ہوش ہو گئی ۔ اس نے کنوئیں کے پانی

میں اپنے بیٹے کے چھپاک سے گرنے کی بھی آواز نہ آئی۔ وہ دو، دو بھیور بھی وہاں پانی بھر رہے تھے ان میں سے ایک زبان کے پاس بیٹھ گیا کہ کہیں جوش میں آکر کنوئیں میں نہ کود جائے، دوسرا سرپٹ بھاگتا ہوا گاؤں میں آیا، گلی گلی میں لوگوں کو اس حادثے کی اطلاع دیتا چلا گیا۔ پھر مسجد میں پہنچ کر حجرے سے نقارہ اٹھایا اور وہیں دہلیز پہ بیٹھ کر اسے پاگلوں کی طرح پیٹنے لگا۔

کنواں، پہاڑی پہ بسے ہوئے گاؤں کے قدموں میں تھا۔ لوگ جب کنوئیں کی طرف بڑھے تو جیسے انہیں راستے بھول گئے۔ کھیتوں میں کود کر وہ ہری بھری فصلوں میں سے بھاگے اور پھر اونچی اونچی مینڈوں پر سے لڑھکتے ہوئے کنوئیں کی سمت لپکے۔ پورے گاؤں کی عورتیں چھتوں کی منڈیروں پر آ بیٹھی تھیں اور کنوئیں کے قریب سے کالی کالی گٹھڑیوں کی قطاریں معلوم ہوتی تھیں، بچے گلیوں میں سے بھاگے آ رہے تھے۔ پورا گاؤں کنوئیں پر امڈ پڑا تھا۔

کنوئیں پر سب سے پہلے جھیور، کمہار، موچی، میراثی، نائی اور دھوبی پہنچے۔ اس وقت ایک جھیور جیجے کی ماں کے پاس بیٹھا لوگوں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

"جیجے، او جیجے!" اکٹھے بہت سے لوگوں نے کنوئیں کی جگت پہ

جھک کر پکارا۔

ان کی آواز گہرے کنوئیں کی گولائی میں چکر کھاتی ہوئی جیسی نیچے گئی تھی۔ ویسی ہی ایک گونج بن کر اوپر آ گئی۔ اور دور رستہ میں ایلومونیم کی ایک، تھالی کی طرح چمکتے ہوئے پانی کی سطح جوں کی توں رہی۔

رستے کے سرے پر ایک گز لمبی مضبوط لکڑی باندھ کر اس پر ایک نوجوان غوطہ خور کو یوں بٹھایا گیا کہ رستہ سامنے اس کے ہاتھوں میں تھا، رانیں لکڑی پر تھیں اور پاؤں لٹک رہے تھے۔ پھر تو آدمیوں نے رستے کو مضبوطی سے تھاما۔ نوجوان غوطہ خور نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر ایک بار کنوئیں میں دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اترا جانے لگا۔

لوگوں کا ہجوم مسلسل بڑھ رہا تھا۔ چند جمیدہ عورتیں بھی روتی چلاتی آپہنچی تھیں اور کرماں کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگی تھیں۔ چند لوگ بچوں کو کنوئیں کے قریب آنے سے روک رہے تھے۔ اور نوجوان غوطہ خور کنوئیں کے نصف تک پہنچ گیا تھا۔

یکایک کرماں ہوش میں آ گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پھر اس کی پتلیوں میں وحشت بھر گئی۔ اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی مگر عورتوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر وہ ایک دم بچوں کی طرح رونے لگی وہ اپنی رانیں کوٹ کوٹ کر پکارنے لگی "ہائے میرا چنگا۔ میرا لال۔ میرا

چاند کا ٹکڑا۔ میرا سونے کا دانہ، چھن گئے وے چھن گئے۔ تجھے تمہارے رسول کا واسطہ
مرنا نہیں۔ یوں ہنستا ہنستا باہر آجا۔ جیسے تو مدرسے سے آتا ہے۔ مرنا
نہیں میرے بیٹے۔ تو مر گیا تو خدا کی خدائی میں زندہ کون رہے گا؟"

وہ روتی پیٹتی اور بین کرتی رہی۔ عورتیں اس کی ڈھارس بندھانے کی بجائے خود بھی روتی رہیں۔ کنوئیں کے گرد اتنا ہجوم ہو گیا تھا۔ جیسے میلہ لگا ہوا ہے۔ تیس چالیس آدمی کنوئیں کے چار طرف جھک جھک کے ایک دوسرے کو جھک جھک کر دیکھنے سے منع کر رہے تھے اور تاکید بھی کر رہے تھے کہ ایک ذرا سا کنکر بھی نیچے نہ گرنے پائے۔ ورنہ غوطہ خور کو گولی کی طرح لگے گا۔

پھر کنوئیں میں سے غوطہ خور کی گونجتی ہوئی آواز آئی "میں پہنچ گیا ہوں۔ رسّے کو ذرا سا ڈھیلا چھوڑ دو۔ میں غوطہ لگاتا ہوں۔"

سارے ہجوم نے جیسے سانس روک لی۔ کرماں تک خاموش ہو گئی ادھر ہوا میں ایک ٹٹیری "پیاسی ہوں، پیاسی ہوں" پکارتی ہوئی نکل گئی۔

کنوئیں پہ جھکی ہوئی شیشم کی ایک شاخ سے ایک زرد پتہ ٹوٹا اور پھرکی کی طرح چکراتا ہوا کنوئیں میں اتر گیا۔

"کچھ نہیں ملا" پاتال سے آواز آئی۔ "پھر سے غوطہ لگاتا ہوں"

لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کرماں نے بڑی حسرت سے ان کی طرف

دیکھا اور پھر اپنے سر کے بال نوچنے لگی۔

"پانی بہت گہرا ہے"۔ غوطہ خور پکارا۔ "میں تہ کو نہیں چھو سکا۔ سانس ٹوٹ جاتی ہے۔ مجھے کھینچ لو۔"

"ہائے بیٹا ذرا ادھر ادھر کنارے کنارے تو دیکھ"۔ زہراں کنوئیں پر جھک کر پکاری۔ عورتوں نے اسے بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ "ابھی بس نہ آ۔ تیری ماں تیری خوشیاں دیکھے۔ ایک اور غوطہ لگا۔"

پھر وہ رونے لگی اور اس کے آنسو کنوئیں میں گرنے لگے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ نقارہ بجانے والا میرد جمہور سر پہ ایک گھونسا دے کے نیچے کا کھیل تماشا دیکھنے پہنچا۔

"نکلا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" کسی نے کہا۔

"نہیں ماسی۔ کوئی نشان نہیں"۔ غوطہ خور کنوئیں میں سے بولا۔ "پانی بہت گہرا ہے۔ میرے قدم تو تہ پر لگتے ہی نہیں۔ مجھے کھینچ لو۔"

زہراں سینے پر دو ہتڑ مار مار کر پیٹنے اور چیخنے لگی اور لوگ غوطہ خور کو کھینچنے لگے۔

وہ باہر آیا تو ایک اور غوطہ خور نیچے اتارا گیا۔ اسی طرح باری باری پانچ غوطہ خور کنوئیں میں اترے اور یہ کہتے ہوئے واپس آ گئے کہ نہ جانے

کنوئیں میں ایک دم اتنا بہت سا پانی کہاں سے آ گیا ہے۔ تھاہ ملتی
ہی نہیں۔

لوگ چار چار، پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے
اور کرماں روتی پیٹتی رہی۔

ایک آدمی قریب کے گاؤں کو دوڑا کہ وہاں کے مشہور غوطہ خور کو
بلا لائے۔ جھیور اور کمہار کنوئیں پر سے ہٹ آئے اور شیشم کے تنے سے لگ
کر بیٹھ گئے۔ کرماں کو بھی عورتیں کچھ پرے لے گئیں اور تازہ دھوپ میں
کنوئیں کا دہانہ معمول سے زیادہ پھیل گیا۔

کچھ لوگ ٹہلتے ہوئے کنوئیں سے دور نکل گئے۔ اور پھر گاؤں کے
رستے پر ہو لئے۔ گاؤں کی چھتوں کی منڈیروں پر گٹھڑیوں کی تعداد بھی کم ہو
گئی تھی۔

ملک رحمان خان جب نماز اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر
کنوئیں پر آئے تو کرماں کنوئیں کی پرلی طرف اسی طرح رو پیٹ رہی تھی،
ان کے ہاتھ میں تسبیح اور ماتھے پر سجدے کی مٹی تھی۔ آتے ہی انھوں نے
کہا: "کرماں بیچاری کو پیٹنے سے روکو۔ رونے پہ شک، پر پیٹنا جائز
نہیں ہے۔"

کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ ملک رحمان خان نے بھی یہ مشورہ

شاید رسہ گا دیا تھا، کیونکہ وہ بھی کسی کے جواب کا انتظار کیے بغیر کنوئیں کی جگت پہ آ گئے۔ نیچے جھانکا۔ پھر جیسے اپنے آپ کو دھکا مار کر پیچھے ہٹ گئے اور بولے: "ہمارے پہاڑی علاقے کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ پانی بہت گہرائی میں ملتا ہے۔ میدانی علاقوں کے کنوؤں میں تو گبرو شرطیں لگا کر چھلانگیں مارتے ہیں، ہمارے کنوئیں میں تو کوئی گرے تو آدھے راستے ہی میں مارے خوف کے روح قبض ہو جائے۔

"آہستہ بولیے ملک جی" میرو جھنجھلا کر بولا "دو گراں بہن کا تو خیال کیجیے۔"

"تم بھی یہیں ہو میرو؟" ملک جی نے اس کے پاس جا کر کہا "نہیں ملا بیٹے چاند؟"

"جی ابھی نہیں" میرو بولا۔

"یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے"۔ وہ بولے۔

میرو ہوا میں دیکھتا رہ گیا۔

پھر ملک جی نے کہا: "اور بھئی وہ ریت کے تین بورے جو میں نے تم سے لانے کو کہے تھے؟ وہ اگر اگلی صدی میں لانے کے ارادے ہیں تو بھیا، اگلی صدی آئے گی ہی نہیں۔ قیامت آ جائے گی اسی صدی میں۔"

"جی اچھا" میرو بولا اور اس نوجوان کی طرف بڑھ گیا جو ابھی ابھی

گاؤں سے آیا تھا۔ اور کنوئیں میں اترنے کے لئے لنگوٹ باندھ رہا تھا۔

غوطہ خور کو کنوئیں میں اتارنے والے کنوئیں کے قریب آ گئے مگر باقی لوگ ٹکڑیوں میں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے اور ٹہلتے رہتے، جیسے پلیٹ فارم پر ہیں۔ اور گاڑی لیٹ ہے۔

کرماں نئے غوطہ خور کو دعائیں دینے لگی اور ملک رحمان خاں مید سے یہ کہہ کر گاؤں کی طرف چل پڑے کہ نکل آئے تو قبر کی جلدی کرنا شام نہ ہو جائے، میت دن کو دفن ہو تو اس کی قبر میں روشنی رہتی ہے۔"

ملک رحمان خاں گاؤں کی بڑی گلی کی چوڑی والے موڑ پر پہنچ گئے تھے۔ جب غوطہ خور کے قدموں نے پانی کو چھوا۔ مگر یہ غوطہ خور بھی ناکام واپس آیا۔ اور جب تک وہ کنوئیں میں سے نکلتا، ملحقہ گاؤں کا نامی غوطہ خور وہاں پہنچ چکا تھا۔

دوپہر قریب تھی۔ شیشم کا تنا جیسے شانوں کے نیچے ہوئے سائے کو اپنی طرف سمیٹ رہا تھا۔

کرماں نے نامی غوطہ خور کو یوں دیکھا جیسے عقیدت مند کسی ولی اللہ کو دیکھتے ہیں۔ "بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔" اس نے پہلی بار آس پاس کی عورتوں سے بات کی۔" یہ غوطہ مارنے والے ماؤں سے بتیس دھاریں بخشواکے ہوتے ہیں۔ ان کا بخت سلطان سکندر جیسا

کرے۔ خدا ان کی عمر خواجہ خضرؑ جتنی کرے، یہ اپنی ماؤں کے حلالی بیٹے ہیں۔" ۔ ذرا سا رک کر بولی "نیہ رے چنگے جیسے"۔ اور پھر بے تحاشا رونے لگی۔

غوطہ خور چھوٹے قد کا دبلا پتلا جوان تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں رسّہ پکڑ کر کنوئیں کی اساری کے ساتھ ساتھ یوں تیزی سے قدم رکھ کر اترنا شروع کیا۔ جیسے گلی میں چل رہا ہے۔

"رسّہ ڈھیلا چھوڑو۔" نیچے پہنچ کر اس نے پکارا۔

رسّے کو ڈھیلا چھوڑ دیا گیا۔

کنوئیں کی جگت پر فضا کا سنّاٹا اتر آیا اور کرماں سجدے میں گر گئی۔

"پانی بہت گہرا ہے بھائیو۔ دوسرا غوطہ لگا رہا ہوں" غوطہ خور نے اطلاع دی۔

غوطہ خور نے چار غوطے مارے اور جب پانچویں غوطے کے بعد اس نے آواز دی "مل گیا لڑکا" تو دعائیں مانگتی ہوئی کرماں کے چہرے پر ایک چمک سی آ گئی۔ پھر یہ چمک بجھ گئی۔ اور اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔

کسی نے غوطہ خور سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ لڑکا زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ غوطہ خور نے بھی اس سلسلہ میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

آنے والے خطرے کے نیچے دبی ہوئی کرماں یکایک چلّا اٹھی "کیسا ہے میرا بچہ؟"

غوطہ خور نے کوئی جواب نہ دیا اور کرماں کی آواز گہرے کنوئیں کی گولائی میں چکر کھا کر جیسی نیچے گئی تھی۔ ویسی ہی ایک گونج بن کر اوپر آ گئی۔

"ڈھیل چھینچ لو۔" غوطہ خور نے آواز دی۔ "میں لکڑی پر بیٹھ کر لاش کو رانوں پر رکھ لوں گا۔"

رسّہ کھینچنے والے تین آدمیوں نے پہلی بار پلٹ کر دیکھا تو کنوئیں کے مضافات خالی ہو چکے تھے۔ وہ جہاں ایک میلہ سا لگ گیا تھا اب وہاں شیشم کے پتے اتر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سارے گاؤں کی آبادی چپکے سے کنوئیں میں اتر گئی ہے۔ بس چند بچے ایک طرف سہمے ہوئے کھڑے تھے، اور گاؤں کے مکانوں کی منڈیریں نیلے آسمان کو خطِ مستقیم میں کاٹ رہی تھیں۔

"لوگ کہاں گئے؟" میرو جھیور نے حیران ہو کر پوچھا۔

پھر ایک آدمی نے غوطہ خور کو اطلاع دی: "نہ جانے لوگ ایک دم کہاں چلے گئے ہیں۔ ہم کل تین آدمی ہیں۔ دو کو کیسے کھینچیں؟"

"لوگ تھے کہاں؟" غوطہ خور بولا۔ "میں تو جب آیا تھی تین تھے، یا ماسی تھی یا کچھ بچے تھے۔"

کسی کو پتہ بھی نہیں چلا تھا۔ اور لوگ گاؤں واپس جا کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ریڈیو اس پاس

کی پہاڑیوں پر چڑھ رہے تھے۔ اور دوسری ایک چھت پر کوئی عورت دھلے ہوئے کپڑے سکھانے کے لئے پھیلا رہی تھی۔

کرماں کچھ دیر تک گاؤں کو اپنی بھیانک آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں لے کر رسّے والوں کے پاس آئی "لاؤ میں کھینچوں گی۔"

تینوں جھیوروں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ظہرا بابا نے بچوں کو بلایا۔ وہ بلکتے ہوئے آئے، اور رسّے سے چمٹ گئے۔ کرماں سینے پہ ہاتھ رکھے ایک طرف کھڑی رہی۔

آہستہ آہستہ رسّہ کھنچتا رہا۔ کنوئیں کے آخری خطے پر غوطہ خوروں نے جنگے کی لاش اپنی رانوں پر سے اٹھائی مگر اب اسے لینے والا کوئی نہ تھا سب رسّے کو کھینچے کھڑے تھے۔

پھر کرماں آگے بڑھی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اور بازو پھیلا کر بولی "میرے اس پھول کو یہاں میری جھولی میں ڈال دے میرے بیٹے۔"

کرماں جنگے کی لاش کو اپنے بازوؤں میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور گاؤں کی طرف یہ کہتی ہوئی چل پڑی "چل میرے بچے۔ رستہ بتا۔ نہیں دیر ہو جائے گی۔"

میرو جھولا اٹھا کر جیتا تانگا بھاگا آیا۔ اور کرماں کے ساتھ بڑا تیرہ کے

کر کھڑا ہو گیا۔ کرماں نے جنگے کو کانچ کے سامان کی طرح بڑی احتیاط سے کھٹولے پہ رکھا اور پھر بولی۔ "تم تو تین ہو۔ جنازہ تو چار اٹھاتے ہیں"

پھر کسی کو سامنے سے ملک رحمان خان آتے دکھائی دیے قریب آکر وہ بولے۔ "میں سمجھا تھا۔ بہت سے لوگ ہوں گے۔ تو ان سے بات کر لوں گا۔ مگر یہاں تو تمہی تین چار ہو۔ سب چلے گئے تھک کر۔ صبح سے آئے ہوئے تھے۔ اور اب تو ظہر کی اذان ہونے والی ہے۔"

اب ملک رحمان خان کھٹولے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"بات یہ ہے بھئی" انہوں نے کہا "کہنا یہ تھا کہ کفن دفن کے بعد تم لوگ یہیں کنوئیں پہ واپس آجانا۔ جنازے پہ میں لوگوں سے بھی کہہ دوں گا کہ سب کنوئیں پہ چلیں۔ لاش نکل آئی ہے تو کنوئیں کو پاک بھی کر لینا چاہیے دو سو بوکے نکالنے ہوں گے۔ تم جیسے لوگ بوکا خوب کھینچتے ہو۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں اور پھر یہ ثواب کا کام بھی ہے۔"

(دسمبر ۱۹۶۰ء)

ہذا من فضل ربّی

اس چھوٹی سی سڑک کو بلدیہ "پام لین" کہتی ہے۔ دس برس قبل میں
نے اسے نخلستان کہنا شروع کر دیا۔ اور اب کیفیت یہ ہے کہ چند روز
پہلے اسی سڑک پر ایک ہرکارہ "پام لین" کا راستہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ کہیں
یہ نہ سمجھ بیٹھئے گا کہ نخلستان کے بنگلوں پہ کھجوروں کی چھتریاں سایہ کیے کھڑی
ہیں۔ جی نہیں۔ یہاں یوکلپٹس ہے۔ شیشم ہے۔ نیم ہے۔ مگر کھجور کا کوئی ایک بھی
پیڑ نہیں کہتے ہیں پرانے زمانے میں یہاں کسی کا مزار تھا۔ اور اس مزار کے
احاطے میں کھجور کا ایک درخت ہر وقت آسمان کی طرف انگلی اٹھائے
کھڑا رہتا تھا۔ پھر جب شہر پھیلا تو مزار کے متوفی نے احاطے کو مزار سمیت
بیچ ڈالا اور کسی دوسرے مزار میں نکل گیا۔ یہاں ایک بنگلہ تعمیر ہوا۔ نہ جانے
اس بنگلے کا اصل مالک کون تھا۔ مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ ابا جان مرحوم نے
یہ بنگلہ ایک دیوالیہ ہندو سیٹھ سے خریدا اور اس کے ماتھے پہ سے "رام نواس"

کے الفاظ مٹا کر "ہٰذا من فضل ربی" لکھوا دیا۔ میں ابھی "ہٰذا من فضل ربی" میں رہتا ہوں۔

کہتے ہیں اس احاطے کا خریدار بڑا خوش ذوق آدمی تھا۔ اس نے مزار کو تو ہموار کر دیا مگر کھجور کے درخت کو نہ چھیڑا۔ اس کی رائے میں صرف اس ایک درخت نے سارے بنگلے کے ماحول کو الف لیلوی رنگ دے رکھا تھا۔ بلدیہ نے اسی درخت کی رعایت سے اس چھوٹی سی سڑک کا نام "پام لین" تجویز کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں بنگلے کے کسی مالک نے اس درخت کو کاٹ کر اس سے اپنے گیراج کی چھت کے شہتیر کا کام لیا۔

ابا جان مرحوم نے اس شہتیر کو نکلوا کر وہاں لوہے کا گاڈر لگوا دیا اور شہتیر اپنے ایک مزارعہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ مزارعہ ہماری زمینوں پر اپنے ٹیڑ ایک کوٹھڑیا کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے ابا جان مرحوم سے کہا تھا کہ پرانا دیمک خوردہ شہتیر ہے اور آپ نے اسے گیراج سے اسی لیے نکلوایا ہے کہ کہیں چھت گر کر موٹر کار کو پچکا نہ دے۔ اس لیے بیچارے کو مفت دے دیجیے۔ کڑک کر بولے "کیا وہ ہماری زمینوں کی مفت دیکھ بھال کرتا ہے کہ میں اسے اتنی بہت سی لکڑی مفت میں دے دوں"
خدا بخشے ابا جان مرحوم بڑے دل لگی باز تھے۔

تو وہ میں عرض کر رہا تھا کہ میرا بنگلہ نخلستان میں ہے۔ اور میں

"تنہا میں فضل ربی" میں تنہا رہتا ہوں۔ تنہا ہی سمجھئے کیونکہ میرا نوکروں اور ان کی
بیویوں اور بچوں کا ساتھ بھی کوئی ساتھ ہے۔ البتہ سال ڈیڑھ سال پہلے جب میں
نے خوشیا کو مالی رکھا تو میری تنہائی میں ذرا سی جھری پیدا ہوئی۔ وہ یوں کہ خوشیا
نے آتے ہی میرے بنگلے کے لان اور پھول پھلواری پہ یوں لگ کر محنت کی
کہ اب بھی سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ صبح منہ اندھیرے آتا تھا اور
شام کے جھٹپٹے میں واپس جاتا تھا۔ میں نے ایک دن خوش ہو کر اسے دس
روپے انعام میں دے دیئے۔ تین چار دن کے بعد پھر دس روپے دیئے۔
چند دن گزرے تو پھر دس روپے تھما دیئے۔ انعام و اکرام کی اس فراوانی
کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میری کوٹھی کا لان بہت خوبصورت ہو گیا تھا۔ اور
ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت
کہ اب بھی سوچتا ہوں تو ہاتھ سگرٹ کیس کی طرف بڑھتا ہے۔ صبح جب
میں ناشتہ کر کے لان میں نکلتا تھا تو خوشیا ہاتھ اٹھا کر اور اس کی بیوی
آنکھیں جھکا کر مجھے سلام کرتے تھے اور اپنی نظروں کے ساتھ میری نظروں
کا تعاقب کرنے لگتے تھے جیسے اپنی محنت کی داد مانگ رہے ہیں۔ اور
میں داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ کبھی دس کا نوٹ، کبھی پندرہ
کے نوٹ۔ میں نے انہیں اتنا اتنا دیا کہ وہ انعام لینے سے گھبرانے لگے
مگر میں انعام دیتا رہا۔ بات یہ تھی کہ خوشیا انعام لیتا تھا تو اس کا رنگ

اُڑ جاتا تھا مگر اس کی بیوی کے چہرے پر اکٹھے بہت سے رنگ آجاتے تھے
ایک دن کیا ہوا۔ کہ میں لان میں ٹہلنے نکلا تو مجھے خوشیا کہیں نظر نہ آیا۔ صرف
اس کی بیوی ایک طرف کھرپا چلا رہی تھی۔ وہ سر جھکائے اٹھی اور سر جھکائے
بیٹھ گئی۔ ایسا لگا جیسے مالن نے میرے ہونٹوں سے لگا ہوا پانی کا گلاس
چھین لیا ہے۔ آج میں نے اس کی آنکھوں کے جھکنے کا منظر بھی نہیں
دیکھا تھا۔ اس لئے عجیب تشنگی سی محسوس ہونے لگی۔ سوچا۔ شوہر کے بغیر کچھ
زیادہ ہی شرما رہی ہے۔ ابھی خوشیا آئے گا اور میں اسے انعام دوں گا
تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں برآمدے میں آ بیٹھا تو ذرا دیر کے بعد وہ
آئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گلاب کے پھول تھے۔ اور آنکھیں جھکی
ہوئی تھیں۔ اسی حالت میں وہ بولی "صاحب جی، آپ کا کمرہ کون سا ہے؟"
میں نے کہا "یہ سب کمرے میرے ہیں۔ کیوں؟" بولی "وہ نہیں جی۔ جہاں آپ
سوتے ہیں۔ مالی آج بیمار ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کے سونے والے
کمرے میں یاد سے پھول لگا دوں۔" مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے پوچھا:
"وہ پھول کہاں ہیں؟" اس نے پہلی بار میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں
کو ذرا سا اٹھا کر بولی۔ "یہ ہیں۔" یقین کیجئے اتنی کالی اندر کی اور ڈبڈبائی
ہوئی آنکھیں میں نے صرف تصویروں میں دیکھی ہیں۔ میں نے کہا "کہاں ہیں؟
مجھے تو نظر نہیں آ رہے ہیں۔ مجھے تو صرف ایک پھول نظر آ رہا ہے۔"

اس کی ٹکٹکی بندھ گئی تو میں نے کہا۔ "مجھے تو بھئی صرف ایک پھول نظر آ
رہا ہے۔ مجھے تو صرف تم نظر آ رہی ہو۔"

اس کے چہرے پر گلاب ہی گلاب کھل گئے۔ اور گلاب کے پھول
اس کے ہاتھوں سے گر پڑے۔

جی نہیں۔ وہ میری طرف نہیں بڑھی۔ منطق کا تقاضہ بھی یہی تھا
اور میں نے انھیں انعام سے بھی مالا مال کر دیا تھا۔ مگر وہ پگلی تو بھاگ کھڑی
ہوئی۔ لان میں بھی نہیں گئی۔ جہاں اس کا کھرپا اور قینچی وغیرہ رکھے تھے۔
وہ سیدھی باہر گئی اور اس کے بعد، کوئی ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے،
نہ وہ آئی ہے۔ نہ خوشیا آیا ہے۔ اپنی تنخواہ تک لینے نہیں آئے۔
احمقوں کو میری کوئی بات بری لگ گئی۔ اب بھی ان کی یاد آتی ہے۔
تو منہ کا ذائقہ ایسا لطیف ہو جاتا ہے۔ جیسے الائچی کھا رہی ہو۔ خدا جانے
آج کل کہاں ہیں۔ یہیں اسی شہر میں ہوں گے۔ مگر نہ جانے کس بنگلے میں ہیں
بہر حال جہاں رہیں خوش رہیں۔ ذرا سے بے وقوف تھے ورنہ اچھے
لوگ تھے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں "ہٰذا من فضلِ ربی" میں تنہا رہتا ہوں
نخلستان چار بنگلوں پر مشتمل ہے۔ یہ بنگلے ایک قطار میں ہیں۔ ان کے
سامنے سے گزرتی ہوئی سڑک کے اس طرف شیشم کے درختوں کا ایک

گنجان ذخیرہ ہے ۔ پہلا بنگلہ میرا ہے اور چوتھا سجاد کا ہے سجاد میرا پرانا لنگوٹیا
یار ہے مگر اس سے میری بول چال آج تک بند تھی اور اس کی وجہ معمولی
نہیں ۔ سجاد کے بنگلے سے آگے کھیت شروع ہو جاتے ہیں ۔ اس لیئے یہ
بنگلہ نخلستان کی چھوٹی سی سڑک کا ٹرمنیس ہے ۔ ویسے کھیت والوں کے
ساتھ اس کے تعلقات اتنے اچھے ہیں کہ ضرورت پڑے تو کار کو کھیتوں
میں سے گزار کر چار پانچ فرلانگ پرے ایک کچی سڑک تک لے جاتا ہے ۔
جو شہر کے لیئے اچھے خاصے شارٹ کٹ کا کام دیتی ہے ۔ مگر میں نے اس
سے ہمیشہ بحث کی ہے ۔ کہ شارٹ کٹ کی ایجاد پیدل چلنے والوں نے کی
ہے اور موٹر کار والوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے مگر نہیں مانتا
بہر صورت دو برس پہلے کی بات ہے کہ ایک دن میں اپنی کار میں شہر کی
طرف سے آیا ۔ اپنے بنگلے میں مڑ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے سجاد اپنی چھوٹی
سی کار میں آیا اور میری کار کے ایک پچھلے پہیئے کا مڈگارڈ ادھیڑ کر چلتا بنا ۔
میں اگر حواس قائم نہ رکھتا تو میری کار اپنے بنگلے کی حد بندی سے ٹکرا کر سامنے
سے بھی پچک جاتی مگر میں نے حد بندی سے بس کوئی ایک انچ کے فاصلے
پر کار روک لی ۔ اترا اور کار کے پیچھے جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مڈگارڈ
کاغذ کی طرح پھٹا ہوا ایک طرف لٹک رہا ہے ۔ میں نے یہ کار بلیک میں
خریدی تھی پچیس ہزار میں ۔ اور اب مجھے بلیک میں اس سے کہیں زیادہ

دام مل رہے تھے۔ مگر میں اسے بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ بہت کم اتنی اچھی کاریں میرے ہاتھوں سے نکلی ہیں۔ ادھڑا ہوا مڈگارڈ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ نخلستان کے آخری سرے کی طرف نظر اٹھائی تو یہ دیکھ کر خوشی سی ہوئی کہ سجاد کی کار بھی باہر ہی رکی کھڑی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کار کو بھی کوئی نقصان پہنچا ہے۔ ورنہ کیوں رکتی۔ مگر یکایک اس خوشی پر غصہ غالب آ گیا اور میں کار میں سے نکل کر سجاد کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سجاد وہیل کے سامنے بیٹھا ہنسی سے بے حال ہو رہا ہے۔ اس کا سارا خون اس کے چہرے اور کانوں میں جمع ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ پیٹ کو ہاتھوں سے دبا رکھا ہے۔ مگر ہنسے جا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی سیٹ پہ کود پڑا اور اس نے رکا قہقہہ مارا! جیسے اس کے پھیپھڑے کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ پھر ہاتھ باہر نکال کر اس نے اپنی کار کو یوں تھپتھپایا جیسے گھوڑ دوڑ میں اوّل آنے والے گھوڑے کو تھپتھپاتے ہیں۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تو اس نے اپنی کار میرا مذاق اڑانے کے لیے روک رکھی ہے! چوری بھی اور سینہ زوری بھی!

میں نے گرج کر کہا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے میری کار کا مڈگارڈ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے"۔

وہ بڑی مشکل سے ہنسی پر ضبط پاتے ہوئے بولا۔ "تو میں ہنس کیوں

رہا ہوں؟"

"بڑے حرامزادے ہیں آپ"۔ میں نے کہا۔

وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں مجھے گھورنے لگا اور پھر ایک دم اسی شدت سے ہنسنے لگا۔

میں نے کہا۔ "بڑے اُلّو کے پٹھے ہیں آپ۔"

وہ پھر سنجیدہ ہوگیا مگر اب کے سنجیدہ ہی رہا۔ کار کو اسٹارٹ کرکے اپنے بنگلے کے اندر یوں لے گیا جیسے کار نہیں چلائی، راکٹ چھوڑا ہے۔ میں وہیں کھڑا تھا جب اس نے پورچ میں بریکیں لگاکر کار روکی اور پہیوں سے اتنے زور کی چیخیں بلند ہوئیں کہ اس کے سب ملازم اس کی طرف بھاگے۔ پھر اس نے کار میں سے نکل کر ادھر کا دروازہ اس زور سے بند کیا کہ ادھر کا دروازہ کھل گیا اور وہ پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔

بیتری ایسی کی تیسی! میں نے سوچا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد میں بنگلہ نمبر ۴ میں آج تک نہیں گیا۔ اور نہ سجاد میرے پاس آیا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ سجاد سے میری بول چال یوں بند ہوئی۔ بہرحال سجاد کو ماریئے گولی۔ مجھے تو دراصل باقی دو بنگلوں کا ذکر کرنا تھا۔ ان میں سے میرے بنگلے سے ملحق بنگلہ ایک سابقہ خاں بہادر کا ہے۔ جو آزادی کے بعد اپنا خطاب تو قہرِ درویش برجانِ درویش واپس کر چکے ہیں مگر کہلاتے

خان بہادر ہی ہیں۔ بنگلہ نمبر ۳ ایک ایسے صاحب کا ہے جو آزادی کی وجہ سے
خان بہادر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا عصبی نظام خراب
ہو گیا۔ پھر ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گئے۔ یہ تو میں بتا چکا ہوں
کہ بنگلہ نمبر ۴ میں دو برس سے میرا آنا جانا بند ہو چکا ہے۔ رہے باقی دو بنگلے
تو وہاں میرے جانے یا وہاں سے کسی کے میرے یہاں آنے کا سوال ہی
نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بنگلہ نمبر ۲ کے خان بہادر صاحب سنکی سے آدمی ہیں۔ بنگلے
کے ایک پچھلے کمرے میں دن رات بند رہتے ہیں۔ اور کئی برس سے علم ہندسہ
کی کوئی نئی شاخ ایجاد کرنے کے درپے ہیں۔ رنڈوے ہیں۔ دوسری شادی
کرنے سے پہلے عشق کر بیٹھے۔ ناکام رہے اور علم ہندسہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔
کبھی کبھی اپنی کئی گز لمبی کار میں ہوا خوری کے لیے نکلتے ہیں تو دکھائی دے
جاتے ہیں۔ مگر کار میں بھی انگلیوں پر کچھ گنتے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس
بنگلے میں ان کی اکلوتی بیٹی تابندہ رہتی ہے۔ نفسیات کا ایم۔ اے پاس ہے
اور جب دیکھو لان میں بیٹھی پڑھتی نظر آتی ہے۔ میرے علاوہ بنگلہ نمبر ۳ والوں
کی طرح ان کی بھی کئی مربع زمین ہے۔ بلکہ ان کے تو چند ٹرانسپورٹ کمپنیوں میں
حصے بھی ہیں۔ اس لئے چار یا پانچ ہزار ماہانہ آ جاتا ہے۔

بنگلہ نمبر ۳ کے مالک تو چل بسے ہیں البتہ ان کی بیوی زندہ ہیں۔ انھیں
اپنی کوٹھی کے لان میں پھولوں کی بجائے سبزیاں اگانے کا شوق ہے ایک بار

کدو کی ایک بیل لپلپک کر بنگلے کی حد فاصل پر چڑھ گئی اور پہلی طرف سجاد کے لان میں اتر گئی۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی پھول آئے اور کدو لگے اور یہ کدو سجاد کے نوکروں نے اتار دیئے۔ کسی طرح بی بی جی کو اس چوری کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے اس پر وہ آفت مچائی، وہ آفت مچائی کہ ادھر اپنے لان میں اپنے مالی کے کندھوں پر بیٹھ کر سجاد نے انھیں سلام کیا۔ کان پکڑے۔ معافیاں مانگیں اور بازار سے کدو منگا کر انھیں بھجوائے۔ یوں یہ معاملہ ختم ہوا ورنہ وہ تو "ورٹ" کرنے چلی تھیں۔ ان کی بھی ایک اکلوتی بیٹی ہے۔ نام شگفتہ ہے مگر پژمردہ تخلص کرتی ہے۔ الف اے میں برسوں تک فیل ہوتی رہی تو السنۂ شرقیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ان دنوں ہر سال ادیب فاضل کا امتحان دیتی ہے۔ پرچے میں غالب کا کوئی شعر لکھنا ہو اور وہ اسے یاد نہ ہو تو وہیں امتحان کے کمرے میں ارتجالاً شعر کہتی ہے اور غالب کے سر تھوپ کے چلی آتی ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ نخلستان میں کل چار بنگلے ہیں۔ چاروں استے خاموش ہیں کہ اگر اپنے بنگلے میں لیٹے ہوئے کھانسی آنے لگے تو یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں باقی تینوں بنگلوں میں سوئے ہوئے لوگوں کی آنکھ نہ کھل جائے چاروں بنگلوں کی اپنی اپنی کاریں ہیں۔ سجاد زمینداری کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتا ہے۔ اس لئے اس کے ہاں شہر سے بھی کاریں آتی رہتی ہیں۔ باقی تینوں بنگلوں میں ہفتے میں ایک آدھ بار کوئی ملنے والا آنکلتا ہوگا۔

نخلستان میں ٹریفک بس اتنی سی ہے۔

ایک روز کسی معاشرتی ادارے کا ایک کارکن سائیکل پر میرے بنگلے میں آیا۔ اور مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے ملازم نے یہ کہہ کر اُسے ٹالنا چاہا کہ صاحب سو رہے ہیں، ملازم بے چارہ یہ کیسے کہتا کہ تم سائیکل پر آئے ہو۔ اس لیے ہمارے صاحب سے تمہارا کیا کام ہو سکتا ہے۔ کارکن بولا کہ وہ تو بنگلے کا نام پڑھ کر اندر آگیا تھا۔ میں نے یہ بات سُن لی۔ سچ کہوں شرم آگئی۔ آنکھیں ملتا ہوا باہر آگیا۔ اُس نے مجھے سلام کیا اور بے نام بے پتے کا ایک دعوت نامہ دے کر پوچھا کہ "کیا آپ آنسہ شگفتہ بانو پژمردہ کا پتہ بتا سکیں گے"؟ میں نے اسے بنگلہ نمبر ۳ میں جانے کو کہا اور وہ چلا گیا۔ یہ دعوت نامہ ایک معاشرتی ادارے کی طرف سے منعقد ہونے والے کسی ورائیٹی شو میں شرکت کا تھا۔ ڈرامے اور گانے اور مشاعرے کا پروگرام تھا۔ سوچا۔ چندے وندے کا لالچ ہوگا۔ اس لیے دعوت نامے یوں بغیر کسی نام و نشان کے بانٹے جا رہے ہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ پروگرام میں ضرور شرکت کروں گا۔ (آخر گانے کا پروگرام بھی تو تھا) اور کسی نے چندہ مانگا تو دس پندرہ دے دوں گا۔ (مجھے یہاں یکا یک اپنا مالی اور مالن یاد آگئے۔ اچھے لوگ تھے بیچارے)۔ میں یہ دعوت نامہ کہیں رکھ کر بھول گیا۔ تاریخ تو یاد رہ گئی تھی مگر وقت اور پتہ کون بتائے۔ پھر یاد آیا کہ کارکن شگفتہ بانو کو بھی دعوت نامہ دینے گیا تھا۔

میں سلیپنگ گاؤن اور سلیپروں سے بے پرواہو کر بنگلہ نمبر ۴ کی طرف نکل گیا۔ بنگلے کے لان کو کدو اور کریلے وغیرہ نے ڈھانپ رکھا تھا اور شگفتہ بانو لان کے ایک سرے پر آرام کرسی میں لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس لیے آرام کرسی نے اسے چھپا رکھا تھا۔ میں نے شگفتہ کو اس کے بازو سے پہچانا۔ حسن کے معاملے میں میرا نقطۂ نظر میرا اپنا ہے۔ مجھے نہ جسم کی ساخت متوجہ کر سکتی ہے اور نہ چال کی باضابطہ بے ضابطگی۔ میں صرف چہرے دیکھتا ہوں۔ مگر آج پہلی بار شگفتہ کا بازو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ حسن کا کوئی مرکز نہیں ہوتا۔ یہ منتشر قسم کی کیفیت ہے۔ اور مجھے اس ہم جماعت کا مذاق اڑانے کا افسوس ہے۔ جو ایک لڑکی کے پاؤں دیکھ کر اسے دل دے بیٹھا تھا۔ یہ بازو اتنا سڈول تھا کہ اگر مجھے اردو لغت مرتب کرنے کی توفیق ہوتی تو لکھتا کہ سڈول شگفتہ کے بازو کو کہتے ہیں۔ کدو اور کریلے کے پس منظر میں اس کے بازو کے چمکتے ہوئے خطوط مجھے کبھی نہیں بھول سکتے۔ (نہ جانے وہ مالن کہاں چلی گئی بے چاری)

میں نے شگفتہ کے پاس جا کر کہا: "کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں؟"

اس نے مجھے پہچان لیا۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑی ہوئی اور پکاری: "امی جان! یہ پہلے بنگلے والے صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں"

"کون کس سے ملنے آیا ہے؟" اس کی امی جان ہاتھوں میں کھرپا اور چہرے پر استفہامیہ لیے کریلے اور کدو کے ڈھیر میں سے نکل پڑیں انہوں نے بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کھرپا زمین پر پھینک کر بڑی طویل و عریض مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "آئیے۔ تشریف رکھیے۔"

مجھے کہنا تو نہیں چاہیے تھا مگر کہہ بیٹھا "افسوس ہے مجھے کھرپے پر بیٹھنا نہیں آتا۔"

پہلے تو دونوں دم بخود رہ گئیں۔ پھر بیقرار ہو کر ہنسیں اور دیر تک ہنستی رہیں۔

آج بھی وہ اسی بیقراری سے ہنستی ہیں۔ اور دیر تک ہنستی ہیں۔ میں جب روزانہ صبح کو کار لے کر شگفتہ کے ہاں جاتا ہوں تو وہ نائیلون کی ہلکی سبز ساری میں ملبوس میرے انتظار میں بھنڈیاں توڑ رہی ہوتی ہے (مجھے ہلکا سبز رنگ بہت بھلا لگتا ہے) مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ ہنسی پر ضبط کے مارے سرخ ہو جاتا ہے۔ اور وہ پکارتی ہے "امی" "فضل ربی صاحب آ گئے۔" کدو کی بیلوں میں سے آواز آتی ہے "تو پھر انھیں بٹھاؤ کھرپے پر۔" پھر ہم تینوں زور زور سے ہنستے ہیں۔ اور بڑی بی کو وہیں سبزیوں ترکاریوں میں چھوڑ کر کار میں بیٹھتے ہیں اور سڑک پر آ جاتے ہیں۔

کبھی میں کار چلاتا ہوں اور شگفتہ میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی ہے اور میری ٹائی کی ناٹ کو کستی اور ڈھیلا کرتی رہتی ہے۔ کبھی شگفتہ کار چلاتی ہے۔ اور میں اس کے بازوؤں کو دیکھتا ہوں اور انھیں سہلاتا ہوں اور ران سے اپنا چہرہ ملتا ہوں۔ شگفتہ بہت پیاری لڑکی ہے (جب تک کسی عورت کی شادی نہ ہو جائے میں اسے لڑکی کہنا پسند کرتا ہوں) وہ میری پہلی دریافت ہے (سوچتا ہوں زندگی میں کبھی ایک بار کہیں سر راہے اس مالن سے میری مڈبھیڑ ہو جائے تو مزا آجائے)

تو میں عرض کر رہا تھا کہ شگفتہ بنگلہ نمبر ۲ میں رہتی ہے۔ ایک صبح کو میں روزانہ کے پروگرام کے مطابق شگفتہ کو بنگلہ نمبر ۲ میں اتار کر گھر پہنچا۔ کھانا کھایا۔ سگریٹ پینے لگا تو سگریٹ لائیٹر غائب تھا۔ یکایک یاد آیا کہ واپسی پر لائیٹر شگفتہ کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اسے جلا جلا کر مجھے بار بار دھمکی دیتی تھی۔ کہ "جلادوں تمہاری مونچھیں؟" (جی ہاں۔ میری مونچھیں ہیں)

لائیٹر لینے شگفتہ کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بنگلہ نمبر ۲ میں تابندہ بیگم کے ہاں گئی ہے۔ گھر واپس آ کر ملازم کو بنگلہ نمبر ۲ میں بھیجنا چاہا مگر پھر سوچا شگفتہ محسوس نہ کر بیٹھے۔ خود جانا چاہیئے۔ خود چلا گیا۔ ملازم نے اندر اطلاع دی۔ پھر مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔ شگفتہ وہاں ہوتی تو میرا نام سن کر دوڑ آ جاتی یا کم سے کم اپنی موجودگی کا ثبوت ضرور دیتی مگر دیر تک کچھ نہ ہوا۔ میں اس

کے انتظار میں دروازے کے پردوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ بڑے عجیب پردے تھے۔ ان پر اوپر سے نیچے تک چھپی ہوئی تصویروں میں سے کوئی ایک بھی دوسری سے نہیں ملتی تھی۔ کہیں عورت دودھ بلو رہی تھی۔ کہیں کمہار چاک پر کوزہ بنا رہا تھا کہیں میراثی ڈھول پیٹ رہا تھا۔ ایک کسان ہل چلا رہا تھا۔ ایک کولہو چل رہا تھا۔ ایک دیہاتی لڑکی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ایک گھروندے میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ غرض قسم قسم کے دیہی مناظر کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ثابت ہوا کہ تابندہ نفسیات کی طالب علم سہی مگر آثار قدیمہ کی بھی دلدادہ ہے (میں دیہات کو اپنے ملک کے آثار قدیمہ میں شامل کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب بابر نے حملہ کیا تھا تو جب بھی یہ دیہات ایسے ہی تھے)

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کسی نے عطر انڈیل دیا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو تابندہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نہ ایک اور دروازے سے چپکے سے اندر آ گئی تھی۔ میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "معاف کیجئے گا میں آپ کے پردے دیکھ رہا تھا۔"

"میرے پردے؟" تابندہ ہنس کر بولی "جی نہیں۔ میرے ڈرائنگ روم کے پردے۔"

میں جھینپ کر مسکرایا تو وہ بولی "معاف کیجئے گا آپ کو اتنی دیر تک انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑی۔ دراصل میں انسانی رشتوں کی نفسیات کے موضوع پر ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ جس کا آخری باب ختم ہونے کو تھا اور میں ختم کر کے اٹھی اور کیا لپ اسٹک لگانا اور عطر چھڑکنا نفسیات کی ہر کتاب کا آخری باب ہوتا ہے؟) یہ نفسیات

ایسا موذی علم ہے کہ ایک آدھ کڑی غائب ہو جائے تو سارا ڈھانچہ بکھر جاتا ہے۔ آپ کو بھی نفسیات کے مطالعے سے یقیناً دلچسپی ہوگی۔"

"جی ہاں" میں نے کہہ دیا حالانکہ جاسوسی ناول نفسیات میں شامل نہیں ہوتے۔

"تشریف تو رکھیئے نا" وہ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ یہ بتائیے کون کون سی کتابیں پسند ہیں آپ کو؟"

"یہ پوچھیئے کون کون سے انسان پسند آئے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ (بھئی نہ جانے وہ مالن میرے دماغ میں بیٹھی کھرپے سے کیا کر رہی ہے!)

"آپ تو بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔" تابندہ بولی۔ "یہ بتائیے آپ نے کون کون سے انسان پڑھے ہیں۔"

(پھر وہی مالن)

میرے جواب کا انتظار کیئے بغیر اس نے پوچھا۔ "مثلاً کیا ہمارے اس بنگلہ نمبر ۳ والے پڑوسیوں کو پڑھا ہے آپ نے؟"

پھر وہ بول قہقہہ مار کر ہنسی کہ اگر میں بھی نہ ہنستا تو بد تہذیب ٹھہرتا اس لیئے میں بھی ہنسنے لگا۔ (کہیں شگفتہ ہماری باتیں سن نہ رہی ہو!)

تابندہ کچھ اس طرح ہنسی تھی کہ مجھے کہنا پڑا۔ "عجیب سنکی لوگ ہیں۔"

"ونسکی ؟" وہ بولی "واہ جی احمق کہئے۔ اسی شگفتہ کو دیکھئے۔ پانچ لاکھ کے بنگلے میں رہتی ہے اور پڑھتی اردو ہے۔"

تابندہ ایک بار پھر زور سے ہنسی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اب کے پھر زور سے ہنسا اور بولا "وہ بنگلے کے لان میں گلاب اور گیندے کی جگہ کدو اور کریلے اگا رکھے ہیں!"

اس دفعہ تو تابندہ یوں ہنسی کہ اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ——— یہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پھیلیں اور مجھے نگل گئیں۔ ان آنکھوں پر دنیا کے ساتوں سمندر قربان۔ ربالن کی آنکھوں سے کتنی ملتی تھیں یہ آنکھیں مگر وہ ذرا زیادہ کالی تھیں۔ کیا تاروں سے چمکتی ہوئی اندھیری راتوں میں آپ نے سمندری سفر کیا ہے؟

"اوہ" اس نے ہنسی پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "عجیب بے معنی لوگ ہیں۔ توبہ۔" پھر وہ ایک ننھے سے رومال سے آنکھیں پونچھ کر بولی۔ "معاف کیجیئے گا۔ آپ ہمارے یہاں پہلی دفعہ آئے ہیں مگر میں یوں باتیں کر رہی ہوں جیسے آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ ویسے میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ ہزار بار آپ کی آواز سنی ہے۔ ہزار بار آپ کی کار کی آواز سنی ہے۔ رسمی تعارف نہیں تھا۔ ورنہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے، کہ کتاب اٹھاؤں اور آپ کے لان میں جا بیٹھوں۔ بڑا خوبصورت لان ہے۔"

(بیوقوف تھے دونوں - مالی اور مالن)

"دیکھیئے - آپ تو کمال کرتی ہیں" میں نے کہا۔ "آپ کہیں تو میں اپنا لان آپ کی کوٹھی میں شامل کر دوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ آپ نے تو مجھے شرمندہ کر دیا۔ چلیئے اور لان میں جا بیٹھیئے۔ یقین کیجیئے میں آپ کو ہمراہ لیئے بغیر نہیں اٹھوں گا۔"

"تو چلیئے" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ مجھے کشمیر لیئے جا رہے ہیں۔"

"آیئے" میں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم چل کر بولی۔ "آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ آج آپ یہاں کیسے بھول پڑے۔"

میں نے فوراً کہا (نہ جانے میں نے بغیر سوچے بات کیسے گھڑ لی)۔ "کل کسی ملازم نے بتایا کہ خان بہادر صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ میں نے سوچا۔ تعارف تو نہیں ہے مگر پڑوسی کی حیثیت میں ان کا مجھ پر اور میرا ان پر حق ہے۔ اس لیئے ان کے مزاج پوچھنے چلا آیا۔"

"بالکل خیریت سے ہیں" نازرہ بولی۔ "وہ اپنے حساب، کتاب میں لگے ہوئے ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے"۔ میں نے کہا۔ غلط جگہ کہا مگر کہہ دیا۔ دراصل ہم

دونوں تیزی میں تھے۔

وہ میرے ساتھ میرے بنگلے میں آگئی۔ ماس نے لان کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی۔

وہ سیدھی میرے کمرے میں چلی آتی ہے۔ مجھے کان سے پکڑ کر اٹھاتی ہے۔ اور اپنی کار میں بٹھا کر ہوا ہو جاتی ہے۔ یہ کار جہاں سے گزرتی ہے عطرِ حنا کی لکیریں کھینچتی چلی جاتی ہے۔ تابندہ کی آنکھیں ہر وقت ڈبڈبائی رہتی ہیں۔ میں وجہ پوچھتا ہوں تو وہ کہتی ہے کہ "آنکھوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ صحرا، لالہ زار اور سمندر۔ صحرا پیاسا مارتے ہیں۔ لالہ زار سلاتے ہیں اور سمندر ڈبوتے ہیں۔" میں کہتا ہوں "تو لاؤ مجھے ان سمندروں میں ڈوب جانے دو۔" وہ میری طرف یوں دیکھنے لگتی ہے۔ جیسے میں نے اس کی آنکھیں پیسے دے کر خریدی ہیں۔ اور یقین کیجئے کہ جب وہ میری طرف دیکھتی ہے تو میں ڈوب جاتا ہوں۔ پھر یکایک کسی حادثے سے بچنے کے لئے وہ بریکیں لگاتی ہے۔ جیسے بلبلا ٹھٹے ہیں اور وہ ہنستے ہنستے اپنا برا حال بنا لیتی ہے یوں یہ آنکھیں اور ڈبڈبا آتی ہیں اور یہ سمندر اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ نفسیات کا ایم۔ اے پاس کر لینے کے باوجود نفسیات کے معاملے میں بالکل جاہل ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ جہالت میری نظر میں اس کا بھولپن بن جاتی ہے۔ جب وہ کہتی ہے کہ "تم عمر بھر صرف میرے رہو گے نا؟" اور میں وعدہ

کرتا ہوں کہ عمر بھر اسی کا رہوں گا تو وہ مجھ سے یوں بیقراری سے لپٹ جاتی ہے جیسے میں عمر بھر اسی کا رہوں گا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ بنگلہ نمبر ۱۳ اور بنگلہ نمبر ۷ میں فلاں فلاں لوگ بستے ہیں ضمناً شگفتہ اور تابندہ کا بھی ذکر آگیا اور آنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ شگفتہ کو میں صبح کے بعد اپنی کار میں گھماتا ہوں، تو تابندہ شام سے پہلے مجھے اپنی کار میں گھما لاتی ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ نہ شگفتہ کو میری شاموں کا پتہ ہے نہ تابندہ کو میری صبحوں کا۔ مجھے ان دونوں کی یہ معصومیت بڑی پیاری لگتی ہے۔ (یہاں ایسا محسوس ہوا ہے جیسے مالن کے ہاتھوں سے پھول گر پڑے ہیں)۔

آج صبح جب میں شگفتہ کو دو گھنٹے تک ویران سڑکوں پہ گھمانے کے بعد کار کو گیراج میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا اور سگریٹ سلگانا چاہا (لائیٹر مجھے دوسرے روز ہی صبح کو مل گیا تھا) تو "ہذا من فضل ربی" کے پورچ میں ایک کار آکر رکی۔ میں نے دروازے میں آکر گیلری میں سے جھانکا تو یہ بنگلہ نمبر ۲ کا سجاد تھا۔ میرے جسم کا سارا خون سر میں جمع ہوگیا میں پلٹ کر میز کی طرف بڑھا کہ میز کے دراز میں سے اپنا ریوالور نکالوں (میرے پاس جرمنی میک کا ایک فرسٹ کلاس ریوالور ہے) تو اتنے میں سجاد خادم کے ذریعے اطلاع بھجوانے کا تکلف کیئے بغیر اندر آگیا

اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ وہ بری نیت سے آیا ہے اور مجھے کسی نہ کسی طرح میز کے دراز تک پہنچنا چاہیئے اس لیئے میں نے جسم کو جھٹکے دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ پھر بولا "میری جان مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں دو برس تک تمہارا انتظار کرتا رہا کہ تم اپنی زیادتی پر شرمندہ ہو گے مگر پھر سوچا کہ پہلے میں اپنی زیادتی پر شرمندہ ہوں۔ ڈیئر پیارے۔ تمہاری کار کا نڈ گارڈ تو کوئی دوسری کار بھی ادھیڑ سکتی تھی مگر مجھے گالی صرف تم دے سکتے تھے۔ ہے نا؟" پھر اس نے میرا اماتھا اور میرے گال اور میری گردن چوم لی۔

آدھے گھنٹے کے اندر ہماری حالت ایسی ہو گئی۔ جیسے ہم کبھی خفا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہسکی منگائی رہی ہاں بس دن رات میں دو تین بار یہ شوق کر لیتا ہوں) ایک دوسرے کی پیٹھ اور رانوں پر تھپیڑ مار مار کر ہم نے دو برس کی ساری دھول جھاڑ لی۔

"میں آج کل بہت خوش ہوں۔" سجاد بولا "بس صرف تمہاری دوستی کی کمی تھی۔ جو آج مجھے واپس مل گئی۔ اب تو میں بہت ہی خوش ہوں۔"

میں نے کہا "کیوں؟ کیا کاروبار زوروں پر ہے؟"

"کاروبار تو ہمیشہ زوروں پر رہا ہے۔ خدا کے فضل سے۔" سجاد

ایک نیا پیگ بھرتے ہوئے بولا۔ ”البتہ زندگی میں کچھ کمیاں تھیں ایک تمہارے جیسے دوست کی کمی۔ اور ایک وہ کمی جس پہ شاعر لوگ عمر بھر شعر کہتے کہتے مر جاتے ہیں۔“

”عشق کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

بولا۔ ”ہاں۔ عشق کر رہا ہوں اور بڑے مزے کا عشق کر رہا ہوں ابھی ابھی تمہاری پڑوسن تابندہ کو دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کار سے اتارا ہے۔“

وہ رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے کیوں دیکھنے لگا پھر جب میں نے کہا کہ ”جبھی عطرِ حنا کی لپٹیں آ رہی ہیں“۔ تو وہ ہنسنے لگا۔ اور بولا۔ ”روز کا پروگرام یہ ہے کہ صبح کے بعد دو گھنٹے تمہاری پڑوسن تابندہ کے ساتھ گزرتے ہیں اور شام سے پہلے کے دو گھنٹے اپنی پڑوسن شگفتہ مجھے اپنی کار میں لے جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ نہ شگفتہ کو میری صبحوں کا پتہ ہے نہ تابندہ کو میری شاموں کا۔“ وہ میری ران پہ ہاتھ مار کر زور سے اونچا ہنسنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”بڑے اُلّو ہو۔ ایک وقت میں دو عشق کر رہے ہو۔“

ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”سناؤ۔ آج کل تم کیا کر رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”یار وہ میرا ایک پرانا مالی تھا نا خوشیا۔ اس کی تلاش میں ہوں۔ اس کے بغیر لان تباہ ہوگیا ہے۔“

سجاد نے قہقہہ مارا۔ ”تم وہی بور کے بور ہی رہے۔“ پھر یکایک سنجیدہ ہوکر بولا۔ ”بھئی خدا کے لئے اتنا کسی کو نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”لاحول ولا قوۃ۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔“

(نومبر ۱۹۵۹ء)

اُصول کی بات

"تو وہ تم ہو" زمیندار نے عبداللہ کو سر سے پاؤں تک اور پھر پاؤں سے سر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی" عبداللہ نے خاکساری کے وہ تمام تاثرات چہرے پر بکھیر لیے جن کے ہوتے ہوئے اس نے اب تک اپنی جان سے ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔

"پر تم تو بوڑھے ہو" زمیندار نے جیسے اس پر تھوک دیا۔

عبداللہ ذرا دیر کے لیے بجھ گیا۔ پھر فوراً اپنی لمک کو پہنچا۔

"میری عمر تو سرکار یہی کوئی پانچ کم پچاس ہوئی"

"وہ پانچ اوپر پچاس تو نہیں ہے؟" زمیندار نے مسکرا کر بھری ہوئی چوپال پر نظر دوڑائی "اوپر نیچے کا دھوکا تو ہو ہی جاتا ہے۔"

لوگ زور زور سے ہنسنے لگے اور زمیندار پیچوان کی نے کو ایک مونچھ پر پھیرتا رہا۔ قہقہے رکے تو اس نے عبداللہ سے پوچھا۔

"جب تم پیدا ہوئے تھے تو ملکہ وکٹوریہ کا راج تھا نا؟"
عبداللہ لوگوں کو ایک بار پھر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لئے فوراً بولا "جی یہ تو یاد نہیں، پر اتنا یاد ہے کہ ان دنوں ملکہ کا روپیہ چلتا تھا۔"

"اور سنو!" زمیندار نے سب سے جیسے داد طلب کی۔ "ملکہ کا روپیہ تو ابھی کل تک چل رہا تھا" یکایک زمیندار کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی اور وہ رقت سے بولا "ہا۔ کیا روپیہ تھا، سچی چاندی تھی۔ یوں کھنکتا تھا جیسے کٹوری بج رہی ہو۔ ہا۔ کیسے زمانے تھے جو لد گئے۔ مجھے یاد ہے۔ خدا بخشے بابا نے خوش ہو کر کبھی کسی مزارع کو ایک روپیہ دیا تو اس نے ان کی جوتیاں اٹھا کر چوم لیں اور آج کسی کو دس روپیے بھی دے دو تو وہ دس روپوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ دینے والے کے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے کہ شاید وہ دس روپے اور نکالے۔"

لوگ جو پہلے محظوظ ہو رہے تھے۔ سنجیدہ ہو گئے۔ پرلے کونے سے ایک آدمی بولا "اس زمانے میں تو سرکار، ایک روپے سے لٹھے کی چادر بن جاتی تھی، آج دس روپوں میں کھدر کی چادر بھی نہیں بنتی۔"

زمیندار نے حقے کی نے کو پلنگ کی پٹی پہ پٹخ دیا۔ "تو کیا میں نے تم سے لٹھے اور کھدر کا بھاؤ پوچھا تھا؟ کیا کبھی تمھارے باپ

نے بھی لٹھے کی چادر باندھی ہے؟"

سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں سوائے عبداللہ کے کوئی شخص زمیندار کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنی جوتیوں کی نوکوں یا تہمدوں کو درست کرنے لگے تھے۔ پھر جب اس سناٹے کو زمیندار کے پیچواں کی گڑگڑاہٹ نے توڑا تو سب نے ایک ساتھ زمیندار کی طرف دیکھا اور زمیندار نے جیسے سب سے پوچھا "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

کوئی آہستہ سے بولا "ملکہ والے روپے کی بات ہو رہی تھی۔"

"ہاں۔ زمانے بدل گئے۔" زمیندار نے ایک آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہلو بدل کر بولا۔ "کیوں بھئی سنا ہے وہ کرمے کی شادی پر پھلور سے جو میراثی آئے ہیں وہ بلا کے تھہنائی نواز ہیں ذرا انھیں بلاؤ تو چوپال پر۔ ایک چوکی ہو جائے۔"

ایک نوجوان بولا "جی ان کے ساتھ تو بڑے اچھے گانے والے بھی ہیں۔"

"ان سے بھی کہہ دو۔" زمیندار نے حکم دیا۔ "شام کی نماز کے بعد ہم اکتارے پر بلھے کی کافیاں سنیں گے اگلے دھو کر آئیں۔"

"جی اچھا۔" اکٹھی بہت سی آوازیں آئیں۔

زمیندار بولا۔ "تم لوگوں نے سنا ہو گا یہ کہ آپ پہلے مجرا کرانے کی سوچ

رہا تھا۔ اور ملتان جا کر قدو۔ کنجری سے بات بھی کر آیا تھا"

"جی!" کسی نے تائید کی۔

"میں نے اسے کہلوا بھیجا تھا کہ اگر مجرا کرنا ہے تو پہلے چوپال پر آ جاؤ تاکہ یہاں میں تمہاری چمڑی اتار کر رکھ لوں اور باقی کو مجرا کرنے بھیج دوں۔ سارے گاؤں کو پلید کرنے چلا تھا کمبخت۔ ہم نے لڑکے کا بیاہ کیا تو صاحب ضلع کو بلوایا۔ کرمابیاہ کرے تو قدو کنجری کو بلوائے! حرامزادہ"۔

لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ زمیندار ان کی باتیں سن نہیں رہا تھا مگر سمجھ ضرور رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسی کی نیکی اور پرہیزگاری کی باتیں کر رہے ہیں۔ خود آسودگی کے جذبے سے اس نے رخ بدلا اور سامنے دیکھا۔ عبداللہ جہاں کچھ دیر پہلے آ کر رکا تھا، وہیں کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ جو زمیندار کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے جڑ گئے تھے اب تک جڑے ہوئے تھے۔ البتہ اب ذرا سے ڈھیلے ہو گئے تھے اور اس کے انگوٹھے کے ناخن پر ایک نئی سی گنت وصامت بیٹھی تھی۔

"تم اب تک یہاں کھڑے ہو؟" زمیندار نے پوچھا۔ جیسے وہ کچھ دیر کے لئے سو گیا تھا۔ عبداللہ نے جواب میں جڑے ہوئے ڈھیلے

ہاتھوں کو پھر سے اکڑا لیا۔

"اولاد ہے؟" زمیندار نے پوچھا۔

"جی ایک بیٹی ہے۔ ایک بیٹا بھی تھا ہے چارہ خدا نے لے لیا۔"

"کیسے مرا؟"

"جی دق سے۔"

"تو پھر تمھیں بھی دق ہو گی" زمیندار نے جیسے اس کے منہ پر دوبارہ تھوک دیا۔ عبداللہ اپنی آنکھوں میں ریت ڈالے چپ چاپ کھڑا رہا۔ جیسے مرض کی تشخیص اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

زمیندار نے جیسے آخری فیصلہ سنانے سے پہلے پوچھا۔ "نام کیا ہے تمھارا؟"

"عبداللہ" وہ بولا۔

"تو پھر ڈنڈا لکھو۔ پورا نام کس نے پوچھا تھا؟"

عبداللہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"دیکھو بھئی ڈنڈے۔ میں زمینوں کو جتواتا نہیں ہوں۔ میں تو انھیں کولھو میں پلواتا ہوں اور یہ کولھو چلانے کے لئے مجھے بڑے بڑے مضبوط بیلوں جیسے کسان چاہئیں۔" لوگوں کی ہنسی نے زمیندار کی بات کاٹ دی۔ وہ خود بھی ذرا سا مسکرایا۔ پھر بولا۔ "اور تم بڈھے آدمی

ہو۔ بال کھچڑی ہو رہے ہیں۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ تم کیا ہل چلاؤ گے!
اور پھر فرض کیا تم نے ہی چلایا۔ پر تم اکیلے آدمی ہو۔ بیمار پڑ وگے تو کھیتوں کی رکھوالی کون کرے گا؟ بیٹی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ بیوی ہے؟"

"جی ہے۔"

"چلو یہ تو اچھا ہے۔ بیوی تو ہے۔ بیوی ہونی چاہیئے — ہل چلاتی نہیں پر چلواتی تو ہے۔"

لوگ پھر ہنسے۔

"تو یوں کہو کہ تم کل تین ننگ ہو۔" زمیندار بولا "لڑکا ہوتا تو شاید تمھارا کام بن جاتا اور ہاں تم نکلے کیوں گئے پہلی زمینوں سے؟"

"بس اتنی بات ہوئی سرکار۔" عبداللہ نے جڑے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو انگلیوں کی پوروں تک لا کر کہا "میں نے کہا چنا مہنگا جا رہا ہے۔ بولے نکل جاؤ۔"

"نکالا تو ٹھیک نکالا۔" زمیندار نے ایک بھوں اچکائی "اب اگر میں ملکہ کے روپوں کی بات کروں اور کوئی لپھڑے کھدر کا بھاؤ لے بیٹھے تو بتاؤ میں اس کے ساتھ کیا کروں، یہی کروں گا اور کیا کروں گا۔"

سب نے ایک بار پلٹ کر پرلے کونے کی طرف دیکھا جہاں ایک آدمی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

پہلو بدل کر زمیندار نے سامنے اصطبل کی طرف دیکھا۔ جس میں شُشکی،
کمیت اور سفید رنگ کے تین گھوڑے توبڑوں میں منہ ڈالے کھڑے
تھے "کیوں بھئی - اب ٹھیک ہے نا؟" اس نے سارے مجمع سے پوچھا
"تھانیدار کے گھوڑے کو ادھر بھینسوں کے پاس بندھوا دیا ہے۔ تمہی
میں سے کسی نے کہا تھا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے"
کوئی بولا "اچھا خاصا ہے تھانیدار کا گھوڑا پر اِن گھوڑوں کے
سامنے تو گدھا سا لگنے لگتا ہے"
قہقہوں کے ایک دور کے بعد زمیندار گھوڑوں، تھانیداروں اور
روئی کے نرخوں کی باتیں کرنے لگا اور کچھ دیر کے بعد زری سے بچھے ہوئے
حقے پر بڑی بے پروائی سے گھسیٹتا چوپال سے اٹھ گیا۔ لوگ ایک دوسرے
کے پاس کھسک آئے اور حقے گڑگڑانے لگے۔ اور عبداللہ اکیلا رہ گیا۔
وہ بہت اداس تھا۔ پہلے زمیندار نے اسے صرف اس لئے جواب
دیا تھا کہ "آج کل چنا تو بہت اونچا جا رہا ہے سرکار" اس نے یونہی رَو
روی میں یہ بات کہہ دی تھی جیسے کوئی موسم کی خرابی کی بات کہہ دے۔ مگر
زمیندار نے اس کا کچھ اور مطلب لیا "وہ یہ چنا؟ یہی چنا جو ہمارے گھوڑے
کھا رہے ہیں؟"
"جی سرکار" عبداللہ نے کہا تھا۔

اور زمیندار نے پوچھا تھا "خوب سوچ کر بتاؤ۔ بہت مہنگا جا رہا ہے نا؟"

"جی ہاں۔ بہت ہی مہنگا" عبداللہ نے پھر کہا تھا۔

اور زمیندار نے اسے چابک مارتے ہوئے کہا تھا "نکل جاؤ یہاں سے نمک حرام کہیں کے، کتنے برسوں سے تم ہمارا دانہ کھا رہے ہو۔ آج ہمارے گھوڑے نے تمہارا دانہ کھا لیا تو دانے کے نرخ یاد آ گئے؟"

اور عبداللہ اس گھر دندے سے نکل آیا تھا جس میں اس نے گیارہ برس گزارے تھے اور جب اسے لائل پور گئے ہوئے بیٹے کی چٹھی ملتی تھی کہ میں مزدوری کر کے اپنے علاج کے لیے روپیہ کما لیتا ہوں اور آپ لوگ زیادہ فکر نہ کریں تو وہ اسی گھر دندے کے آنگن میں گھنگنیوں کا دیگچا پکاتا تھا اور چڑیوں، کوّوں اور لالیوں میں بانٹ دیتا تھا۔ اسی کے آس پاس کے پیڑوں میں اس نے اپنی بیٹی ماکھاں کے لیے جھولے ڈالے تھے اور جب وہ ہل چلاتا تھا اور اس کی بیوی بیگاں اُسے روٹی اور چھاچھ پہنچانے آتی تھی تو ماکھاں جھولا جھولتی اور گاتی تھی۔

ڈاچیاں کچاوے
ویر خیریں آوے
بابا میرا لسّی پیوے
اماں میری لسّی جیوے

دیہ یاد آوے
ڈاچیاں کچاوے
دیہ خیبری آوے

اس وقت عبداللہ کا جی چاہا کہ اونچے سروں میں "ڈاچیاں کچاوے" گانے لگے اور ساتھ ساتھ رونے لگے اور جب لوگ اس سے وجہ پوچھیں تو انھیں بتلائے کہ "میں نے عمر بھر اپنے ہاتھ کی حلال روزی کھائی ہے پر کل میں نے ایک گاؤں کی مسجد میں جا کر نماز کے بعد بھیک مانگی تھی اور جب میں بھیک مانگ رہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو چلنے لگے تھے۔ پھر جب میں چار روٹیاں اور چار آنے لے کر بیوی اور بیٹی کے پاس آیا تھا تو بیوی نے کہا تھا "کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے پہلے تم خون پسینہ بیچ کر روٹی لیتے تھے۔ جھگڑا تو روٹی ہی کا ہے بابا۔ امام صاحب کو بھی آج اس مسجد میں روٹی نہ ملے تو کل کوئی دوسری مسجد ڈھونڈیں۔ اللہ اللہ کرو وہ جب ترس کھائے گا تو بدلہ چکا دیں گے۔ چار روٹیاں لائے ہو۔ آٹھ اپنے ہاتھ سے پکا کر اور گھی لگا کر فقیروں کو نہ کھلاؤں تو ڈائن ہو کر مروں۔"

اور میں نے بیوی کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا جیسے وہ بولی تو میں مر جاؤں گا۔

عبداللہ اچانک اٹھا اور چوپال کے پچھواڑے کی طرف لپکا۔ جہاں ایک کیکر کے نیچے وہ بیگاں اور ماکھاں کو بٹھا آیا تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ کیکر کے نیچے موجود نہیں ہیں۔ ذرا سا ٹھٹکا مگر پھر کیکر کے نیچے جا پہنچا اور اس کے تنے پہ ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک آشیانوں کی طرف جاتی ہوئی چڑیوں کا ایک بہت بڑا غول کیکر پہ اترا اور اس کی ہر شاخ پر گیندیں سی لٹک گئیں۔ عبداللہ کو پہلی بار چڑیوں کا شور بہت برا لگا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر کیکر کے تنے پہ زور سے لات ماری اور سب گیندیں ایک ساتھ فضا میں اچھل کر غائب ہو گئیں۔ چڑیوں کے پروں کی جھپٹ میں آئے ہوئے کیکر کے پھولوں نے زمین پہ ہلدی سی بکھیر دی تھی اور آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ایک گھنی بدلی میں سے تیروں کی طرح نکلی پڑ رہی تھیں۔

عبداللہ چوپال کی طرف پلٹا تو سامنے سے اسے بیگاں آتی نظر آئی اگر گلی میں سے ایک پنہاری نہ گزر رہی ہوتی تو وہ بیگاں کے پاس بھاگ کر پہنچ جاتا۔ پھر بھی وہ بظاہر تیز نہ چلتے ہوئے تیزی سے بیگاں کے پاس پہنچا۔ مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے بیگاں ہی بولنے لگی "ادھر ڈیوڑھی میں ایک زنانہ کسان خانہ ہے۔ ہم اس میں چلی گئی ہیں۔ سب نوکرانیاں بھی وہیں سوتی ہیں۔ بڑی اچھی لوگ ہیں۔ وہی ہمیں وہاں لے گئیں"

پھر ہمیں چینی کی چائے پلائی۔ پھر اپنے دکھوں دردوں کی باتیں بھی ہوئیں۔ اس وقت مالکھاں اُن کے ساتھ چائے کے برتن دھو رہی ہے۔ میں نے کہا: میں تمھاری خبر لے آؤں، تمھیں چائے ملی؟

"مجھے تو ابھی حقہ بھی نہیں ملا" عبداللہ نے کہا "پر تمھاری بات سن کر سمجھو پی لی۔ ویسے بگاں! کام بنتا نظر نہیں آتا۔ زمیندار کے منشی کا پتہ لگاتا ہوں، وہ ملے تو اس کے پاؤں پکڑ لوں۔ تم بھی کسی نوکرانی سے زمیندارن کو کہلواؤ۔ کوسوں تک پھیلی ہوئی زمینیں ہیں۔ ایک آدھ بیگھ ہمیں مل جائے تو کیا بگڑ جائے گا ان بادشاہوں کا۔"

بگاں وعدہ کر کے چلی گئی اور عبداللہ چوپال پر آگیا۔ لوگ اٹھ گئے تھے۔ صرف ایک سائیس بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ عبداللہ سیدھا اس کے پاس جا بیٹھا۔ سائیس نے حقہ اس کی طرف گھما دیا اور جب عبداللہ چند کش لگا چکا تو سائیس بولا "بڑا برا زمانہ آلگا ہے چاچا۔ پیٹ کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اب تم پکی عمر کے آدمی ہو۔ یہ تمھارے آرام سے کھٹولے پر بیٹھ کر حقہ پینے کے دن تھے۔ مگر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہو دربدر کی۔ خدا اگر آدمی کا پیٹ نہ لگاتا تو کوئی ٹنٹا ہی نہ ہوتا۔ ذرا یہ پھاوڑا لے کر گھوڑوں کی لید تو سمیٹ لو۔ میں جا کر گودام سے تمھارے لیے کھٹیا نکال لاؤں۔"

عبداللہ چپکے سے بھیا وڑا اٹھا کر اصطبل کی طرف چلا گیا اور سائیس چوپال سے اتر گیا۔ شام کے بعد ایک آدمی عبداللہ کے لیے کھانا لے آیا۔ ذرا دیر بعد چوپال پر گاؤں والوں کا ریلا سا آ گیا۔ اکھٹی چار پانچ لالٹینیں جلنے لگیں۔ مراثی بھی آ گئے اور ڈھولوں، شہنائیوں کو درست کرنے لگے۔ پھر جب زمیندار نے چوپال پر قدم رکھا تو بالکل وہ کیفیت چھا گئی جب سینما ہالوں میں فلم شروع ہونے سے پہلے بتیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ پہلے شہنائی والے نے اپنا کمال دکھایا۔ پھر گانے والے نے بلھے کی کافیاں اور علی حیدر کے دوہے سنائے آخر زمیندار نے دس روپے کا ایک نوٹ ایک ہاتھ میں اور دوسرا نوٹ دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ شہنائی والا آگے بڑھا اور ایک نوٹ لے کر سلام کرتا ہوا الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ گانے والوں میں سے بھی ایک نے یہی کیا۔ پھر سائیس نے آگے بڑھ کر فرش پر چادر بچھا دی اور اس پر ایک دوّنی رکھ دی۔ ہر شخص جیب میں ہاتھ ڈالتا یا ٹینک کھولتے آگے بڑھا اور سب نے ایک ایک دوّنی چادر پر رکھ دی۔ عبداللہ کے لیے یہ سب باتیں نئی تھیں۔ مگر دوسروں کی دیکھا دیکھی اٹھا اور مسجد سے خیرات میں ملی ہوئی چوّنی ٹینک سے کھول کر اور آگے بڑھ کر زمیندار کے قدموں میں چادر پر ڈال دی۔ اور ابھی وہ ایک دوّنی اٹھا لینے کی سوچ رہا تھا کہ زمیندار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اچھا تو تم دستے ہو۔" پھر وہ لوگوں سے مخاطب ہوا

"بھئی لوگو دیکھ رہے ہو اس بڈھے کو۔ تم سب نے ایک ایک دونی
دی ہے اور اس نے یہ میرے سامنے جوتی لا کر رکھ دی ہے۔ یہ فرق ہے
پرانے اور نئے زمانے میں۔ اسے کہتے ہیں وضعداری کہ روزگار ہے نہیں۔
زمینوں کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ابھی میرے مزارعوں میں شامل
نہیں ہوا مگر اصول کی بات، اصول کی بات ہے اور اس نے جوتی کھول
کے رکھ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کبھی پرانے لوگوں کو بہت پسند کرنے
لگتا ہوں۔ ان نوجوان مزارعوں کو تو اتنا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ زمیندار کی جوتی
سیدھی کیسے کی جاتی ہے۔ جاؤ بھئی دستے بیٹھ جاؤ۔ کھانا دانا تو مل گیا نا تمہیں۔"

"مل گیا سرکار" دولا مارے خوشی کے کانپ رہا تھا۔ "آپ کے بچے
جیئیں۔ آپ کی زمینیں پھلیں۔"

دونیوں کو گن لیا گیا اور انہیں برابر تقسیم کر کے شہنائی بجانے والے اور گویوں میں تقسیم کر دیا گیا
اور جب محفل برخاست ہو گئی۔ اور چوپال میں صرف ایک دیا جلتا
رہ گیا تو عبداللہ اٹھ کر اپنے کھٹولے پر آ بیٹھا۔ چوپال کے صحن کے پرلے
کونے پر چار کھاٹیں بچھی ہوئی تھیں۔ اور چاروں آدمی بار بار حقہ پی رہے
تھے اور کھانس رہے تھے۔ عبداللہ کا جی چاہا کہ وہ ان کے پاس جا کر باتیں
کرے مگر اتنے میں سائیں آ گیا۔ وہ اس کی پائنتی بیٹھ گیا۔ اور بولا "منا
بات تو کچھ بنتی ہوئی معلوم ہوتی ہے چاچا۔ تمھاری جوتی کام کر گئی۔ ایسی

باتوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں سرکار۔ میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ وہ جس آدمی نے لٹھے اور کھدر کی بات کی تھی نا۔ اسے سرکار نے نکال دیا ہے یوں سرکار کی خاص شکار گاہ والی زمینیں تمھیں ملنے والی ہیں۔ ایک تو ویسے ہی یہ زمینیں سونا اگلتی ہیں۔ دوسرے مہینے میں دو بار نہیں تو ایک بار تو سرکار ضرور وہاں جاتے ہیں۔ چھوٹی سی بنگلی بنی ہوئی ہے۔ وہاں ٹھہرتے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں۔ تمھیں یہ زمینیں مل جائیں تو سمجھو تمھارے دلدّر دور ہو گئے۔ پرانے مزارعوں نے سنا کہ بنگلی کا علاقہ تمھیں مل رہا ہے تو وہ اب چوکی کے بعد سرکار کے پیچھے پڑ گئے کہ ہم پرانے خدمت گار ہیں۔ اور ان زمینوں پر ہمارا حق زیادہ ہے۔ مگر سرکار نے ڈیوڑھی کے اندر جاتے ہوئے بڑے مزے کی بات کہی، کہنے لگے: ”شاید پہلے میں کچھ سوچتا مگر اب تو اصول کی بات ہے۔ تمھیں جلانے کے لیے اب تو یہ زمینیں ڈٹے ہی کو دوں گا۔“ میں مٹھائی نہیں چھوڑوں گا چاچا۔“

عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائیں کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ اچانک سائیں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ”نہیں چھوڑوں گا مٹھائی“ اور پھر چلا گیا۔

اور عبداللہ نے کھٹولے پر لیٹے ہوئے اتنی لمبی انگڑائی لی کہ اس کے تمام جوڑوں میں سے پٹاخے چھوٹنے لگے۔ پھر اس نے کچھ پڑھ کر اپنے

چاروں طرف چھوہ کی، چولے کا ایک بٹن کھول کر اپنے سینے پر چھوہ کی اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔

ذرا سویا تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے ہلا دیا۔ "کون ہے؟" اس نے پوچھا

وہ سائیس تھا پائنتی کی طرف بیٹھتے ہوئے بولا، "دیکھو چاچا یہ بڑا ضروری کام ہے۔ اس لیے تمہیں جگا دیا۔ وہ بنگلی والی زمین سرکار نے تمہارے نام کر دی تھی نا۔ منشی سے بھی کہہ دیا تھا۔ اور یہ بھی انتظام کر دیا تھا کہ صبح کو تم بیلوں کی ایک جوڑی بھی پسند کر لو، مگر اب معاملہ کچھ بگڑ گیا ہے۔ تم سے کچھ ہو سکتا ہے تو کرو۔"

عبداللہ نے چادر ایک طرف اتار کر رکھدی۔ اور سائیس کے قریب ہو کر بولا "وہ کیا ہو گیا ہے ایک دم؟ تم بتاؤ تو سہی مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔"

سائیس آہستہ سے بولا۔ "میں تمہیں لے چلتا ہوں ڈیوڑھی میں، یوں کروں کہ تمہاری بیٹی سے نا ماکھاں، اس کو سمجھا دو۔"

"کیا سمجھا دوں؟ وہ کیا کرے گی؟" عبداللہ نے پوچھا۔

اور سائیس بولا۔ "ارے چاچا۔ اس کو سمجھا دو نا۔ اس سے کہہ دو نا کہ مان جائے۔ آدھی رات ہونے کو آئی ہے۔ اور وہ اب تک

نہیں مانی ہے۔ نہ وہ مانتی ہے نہ اس کی ماں اُسے مناتی ہے۔ اب اگر تم بھی نہ منا سکو تو سرکار کہتے ہیں کہ اپنی راہ لو۔ اصول کی بات ہے!"

(جولائی ۱۹۵۶ء)

موجِ خوں

شادی کے تین دن بعد راحت علی کو یکایک محسوس ہوا کہ اس نے ساجدہ کو اپنی بیوی بنا کر جھک ماری ہے۔ یکایک اس لیے کہ ابھی لمحہ بھر پہلے ساجدہ اس کے ذہن پر آسمان کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

کچھ دیر پہلے جب گاڑی جہلم کے پل پر سے گزر رہی تھی تو ساجدہ نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اور پل کی گرج کو ایک لمحہ کان دھر کر سننے کے بعد اس نے کہا تھا۔ "ارے! ایسا لگتا ہے کہ پل "جہلم جہلم جہلم جہلم" پکار رہا ہے۔" اس پر راحت علی نے کہا تھا۔ "تمہیں اپنے میکے جانے کا کتنا شوق ہے سجو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان دنوں میں بھی تمہارے میکے ہی میں رہوں گا پر ایسا لگتا ہے۔ کہ تمہارے ماں باپ دو تین دن کے لیے تمہیں مجھ سے چھینے لے رہے ہیں۔ سچ کہتا ہوں سجو میں نے تو ابھی جی بھر کر تمہیں دیکھا بھی نہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ میرے ہاتھوں کی ہڈیاں تمہارے کنگنوں کی چوڑیاں

کھانے کے لئے کتنی مدت سے بے قرار ہیں۔ مگر میں تمہارے انتظار میں
اتنی مدت تک جاگتے رہنے کے بعد ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ تمھارا
بھائی تمھیں لینے آگیا۔ بات سنو۔ یوں کریں کہ جہلم میں اتریں ہی نہیں۔ پنڈی
کی طرف بھاگ جائیں۔"

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی۔ وہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔
اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی، غرور بھی تھا اور اس شکاری کی سی خود آسودگی
بھی، جو ہرن کو جال میں پھنسا دیکھ کر اسے جال میں سے نکالنے اور ذبح کرنے
سے پہلے اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لمبے
لمبے کش لگانے لگتا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ "بھاگ تو جائیں پر وہ
پرلی طرف کھڑکی کے پاس بھائی جان جو بیٹھے ہیں؟"

راحت علی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ تو
اسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ اجنتا کے غاروں جیسی دیویاں آج بھی زندہ
ہیں۔ ویسا ہی چکنا چمکتا رنگ کہ اسے دیکھنے کے بعد آدمی کچھ دیکھ ہی نہ سکے
سیاہ بھوؤں کے نیچے اتنی بڑی بڑی آنکھیں کہ بچوں کے چہروں پر بھی بڑی
معلوم ہوں۔ اتنی لمبی پلکیں کہ اگر قمقمہ اس کے سر پہ چمک رہا ہو تو پلکوں
کے سائے اس کے سارے چہرے پہ چلمن سی کاڑھ دیں۔ پتلی ذرا سی جھکی
ہوئی ناک، اور راستہ نہ بار یک ہونٹ جیسے سرخ ریشم کے ایک تار پہ

سرخ ریشم کا ایک تار رکھا ہو ننھی سی گول سی ٹھوڑی اور ایسی شفاف گردن کہ پانی کا گھونٹ بھی اترتا دکھائی دے جائے۔ اس کے جسم کی ساری قوسیں اور تمام زاویے ان دیویوں کے سے تھے۔ راحت علی نے جب بھی ان دیویوں کی تصویریں دیکھی تھیں تو صحت اور جوانی سے لبالب بھرے ہوئے ان کے جسموں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ ان مورتیوں کے خالقوں نے ذرا سا مبالغہ ضرور کیا ہے۔ سنگ تراش مصور اور شاعر، سیدھی سادی صاف نظر آنے والی حقیقت میں فنی حسن صرف یوں پیدا کر سکتے ہیں کہ چلتے چلتے یونہی جیسے روا روی میں ذرا سا مبالغہ برت جائیں۔ مگر ساجدہ کو دیکھ کر ایک پل کے لئے راحت علی کو خیال آیا تھا کہ کیا کبھی خدا بھی مبالغہ کرتا ہے؟ پھر جب اس نے دیکھا تھا کہ یہ مورتی اٹھتی بیٹھتی ہنستی اور چہرے پر اترتی ہوئی لٹوں کو جھٹکتی بھی ہے۔ تو اس نے سوچا تھا کہ بعض حقیقتیں بھی مبالغے کی حد تک حسین ہو سکتی ہیں۔

راحت علی اپنے ایک دوست عبدالحنان کا شہ بالا بن کر برات کے ساتھ لاہور سے جہلم آیا تھا۔ رات کو جب دلہن کی سہیلیاں عبدالحنان کو کان سے پکڑ کر لے جانے لگیں تو ظاہر ہے کہ راحت علی شہ بالا بھی دولہا کے دفاع کے لئے ان کے ساتھ ہو لیا۔ دلہن کی حویلی کے صدر دروازے کے قریب اچانک ایک لڑکی چیخ اٹھی "وہ ہائے۔ ہمارے ساتھ تو یہ کوئی غیر مرد!

بھی آ رہا ہے۔" سب لڑکیاں بلبلا کر دروازے کی طرف بھاگیں، تو آگے
جاتا ہوا عبدالحنان ان کے ریلے میں گر پڑا۔ ایک لڑکی اس کے اوپر سے
کودی اور پھر سب لڑکیاں اس پر سے پھاندتی ہوئی گزر گئیں۔ راحت علی
نے لپک کر عبدالحنان کو اٹھایا تو سامنے سے لڑکیوں نے دو ٹارچوں کی
روشنی ان کے چہروں پر چانٹوں کی طرح دے ماری اور پھر چیخ چیخ کر ہنسنے
لگیں اور تالیاں بجاتی ہوئی اندر بھاگ گئیں۔ اوپر ڈیوڑھی کی چھت پر بھی بھگدڑ
مچ گئی اور راحت علی نے عبدالحنان کو مشورہ دیا کہ سنہری موقع ہے۔ بھاگ
نکلیں۔ عبدالحنان لڑکیوں کی اس بدتہذیبی کی وجہ سے غصے میں تھا۔ کچھ
کہے بغیر پلٹا تو سامنے سے اس کے منہ پر ایک اور ٹارچ کا چانٹا پڑا اور وہ دونوں
دم بخود کھڑے رہ گئے۔ پھر ایک لڑکی یوں ٹخ ٹخ کرنے لگی جیسے دولہے
اور شہ بالے کو بیل سمجھ کر اندر حویلی میں ہنکا رہی ہے۔ مجبور ہو کر وہ ڈیوڑھی
میں آئے تو وہاں تیز روشنی نے رات کو دن بنا رکھا تھا۔ راحت علی نے پلٹ
کر جب اس لڑکی کی طرف دیکھا جو دونوں کو اندر ہنکا رہی تھی، تو ایک دم اس
کا جی چاہا کہ وہ ڈکرانے لگے۔ "منہ پھاڑے کیا دیکھ رہے ہو؟" لڑکی عجب
سے بولی۔ "تم آگے چلو۔" راحت علی نے لڑکی کی آواز پہچان لی۔ یہی تھی جس نے
ایک مردوے کی موجودگی کا نعرہ مارا تھا۔ اور شاید یہی تھی جس نے منہ
کے بل گرے ہوئے دولہا پر سے پھاندنے کی ابتدا کی تھی۔ یہی ساجدہ تھی۔

عورتوں اور لڑکیوں سے ٹھنسے ہوئے ایک کمرے میں جب عبدالحنان
اور راحت علی کے سامنے "بیڑی گھوڑی" لا کر رکھی گئی تھی تو ساجدہ آئی۔
ان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور "بیڑی گھوڑی" میں سجے ہوئے ایک
طشت میں سے میدے کے بھدے بھدے بت اٹھا اٹھا کر دولہا سے ان کا
تعارف کرانے لگی۔ "یہ آپ کے اباجان ہیں۔ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی
توند سے پہچانیے۔" ساٹھ ستر عورتوں کے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے اور کسی
نے کہا۔ "یہ ساجدہ کم بخت تو شیطان کی خالہ نکلی!" ساجدہ دولہا سے مخاطب تھی۔
"یہ آپ کی امی جان ہیں۔ جھینگوں کی طرح لٹکتی ہوئی جھریوں سے پہچانیے یہ آپ
کے ماموں جان ہیں ہتھیلی پہ رکھی ہوئی بیر برابر افیون کی گولی سے پہچانیے
اور یہ آپ کے سسر بالا جان ہیں۔ الو کی سی صورت سے پہچانیے۔" عورتیں یوں
چلا چلا کر ہنس رہی تھیں جیسے رو رہی ہوں۔ اور ساجدہ آخری بت کو راحت علی
کے اتنا قریب لے آئی جیسے اس کے منہ میں ٹھونس دے گی۔ بولی "یہ
آپ ہیں۔ وہی پکوڑا سی ناک ہے کہ نہیں؟ وہی چندھیائی آنکھیں ہیں کہ نہیں
وہی چھاج کے سے کان ہیں کہ نہیں؟ وہی غار سا دہانہ ہے کہ نہیں؟" پھر وہ
عورتوں کے مجنونانہ قہقہوں کے درمیان اس بت کو راحت علی کے سامنے
نچانے لگی۔ "ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟" اور راحت علی
ہکا بکا نظر بہ ظاہر اس بت کو دیکھتا رہا۔ مگر در اصل وہ ساجدہ کو دیکھتا رہا ہو

صنمیاتی دھندلکوں سے نکل کر یہاں چلی آئی تھی اور اپنے ساتھ اتنا بے پناہ اتنا ناقابل برداشت اور قدموں تلے سے زمین کو نکال دینے والا حسن سمیٹ لائی تھی کہ حقیقت اور مبالغے کی حدیں آپس میں خلط ملط ہو گئی تھیں۔

راحت علی کو عبدالحنان پہلے سے بتا چکا تھا کہ دلہن کی خاص سہیلی کی طرح برسوں کی پرانی رسم کے مطابق دولہا کے شہ بالے کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کی آزادی برت سکتا ہے۔ بشرطیکہ بداخلاقی کا مرتکب نہ ہو۔ وہ میدے کے اس بت کو ساجدہ کے ہاتھ سے نوچ کر اسے چرمر کر سکتا ہے مگر وہ تو بنا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور اس کیفیت سے عورتیں اتنی محظوظ ہوئیں کہ ایک دوسرے کو دھکے دے کر راحت علی پر گرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ خود ساجدہ کی یہ حالت تھی کہ چمکتا ہوا سنہری رنگ لہولہان ہو رہا تھا۔ آنکھوں کا کاجل ملا پانی گالوں پر پھیل گیا تھا اور راحت علی کے بت کو دیر تک پکڑے پکڑے اور نچاتے نچاتے اس کا انگوٹھا بت کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔

پھر جب "بیڑی گھوڑی" میں لگے الٹے کٹورے کو سیدھا کرنے کی باری آئی تو ساجدہ نے کٹورے کی طرف بڑھتے ہوئے راحت علی کے ہاتھ کی ہڈیوں پر ٹھوس چاندی کے ایک کنگن کے سرے اتنے زور زور سے مارے کہ کٹورے کو سیدھا کرنا تو ایک طرف رہا راحت علی کٹورے کو چھو بھی نہ سکا۔

عورتیں ہنستی رہیں ۔ اور اسے میاں بدھو جی اور حضور لسنتنا خان کے سے القاب سے نوازتی رہیں ۔ اور ساجدہ کی چوٹوں میں زیادہ شدت اور بے رحمی پیدا ہوتی گئی ۔ ایک بار عبدالحنان نے بھی اسے پیچھے سے ٹھوکا دیا مگر راحت علی کے اٹھے ہاتھ پر کنگن کے نکیلے سرے اسی طرح نیکتے رہے اور کہیں کہیں سے خون بھی پھوٹ نکلا ۔ پھر یکایک راحت علی کو نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے لپک کر ساجدہ کی چوڑیوں بھری کلائی دبوچ لی ۔ کانچ کی چوڑیاں چھنک کر ٹوٹیں ۔ اور ہر طرف سرخ اور سبز بلور کے ٹکڑے بکھر گئے ۔ چند کرچیاں ساجدہ کی جلد میں گھس گئیں اور اس نے چیخ مار کر کنگن گرا دیا ۔ اس کشمکش میں "بیڑی گھوڑی" الٹ گئی اور اس کے گوشوں میں جلتے ہوئے گھی کے چراغ قریب بیٹھی ہوئی عورتوں کی گود میں جا گرے ۔ یہ عورتیں ھڑک کر اٹھیں اور پھر سب ایکدم خاموش ہو گئیں ساجدہ اور راحت علی کے چہروں پہ ایک عجیب سا رنگ آ گیا تھا ۔ ایک ایسا رنگ جس کا کوئی نام ابھی تک تجویز نہیں ہوا ۔ جیسے مٹی اور ہلدی اور خون اور زہر کو آپس میں ملا کر مل دیا جائے ۔ عبدالحنان کے بت میں سے پہلی بار آواز آئی ۔ "ارے کیا کرتے ہو ؟ پاگل ہوئے ہو ؟" مگر راحت علی نے تڑاتی بھڑکتی ہوئی ساجدہ کی کلائی پر سے اپنی گرفت کو ذرا سا بھی ڈھیلا نہ کیا ۔ پھر اچانک ساجدہ کی چیخیں رک گئیں اور اس نے بڑی نرمی سے اپنا دوسرا ہاتھ راحت علی کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے آہستہ سے بڑے دکھ اور بڑی منت کے ساتھ کہا ۔

"ظالم! اب چھوڑ بھی دے"۔ اور راحت علی نے اس کا ہاتھ فوراً چھوڑ دیا۔ ساجدہ نے اپنے چہرے پر اتری ہوئی لٹوں کو سر کے ایک جھٹکے سے الٹا اور اپنی کلائی کے زخموں کو گھورتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ عام سی صورت کی ایک دراز قد اور تنومند لڑکی "بیری گھوڑی" کے رنگین کاغذوں میں لپٹے ہوئے سرکنڈوں کے اس طرف سے بولی۔ "بدتمیز۔ وحشی۔ درندہ" پھر ساجدہ کی طرف بڑھتی ہڑیوں رک گئی جیسے کوئی ضروری بات کہنا بھول گئی ہو۔ پلٹی اور راحت علی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولی "کمینہ"۔

"ہائے نرینہ" کوئی بڑی بی بولی "گالی مت بکو۔"

برات جب واپس لاہور پہنچی تو راحت علی ہاتھ دھو کر عبدالحنان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ اپنی بیوی سے کہہ کر ساجدہ کے رشتے کی بات کرنے میں اس کی مدد کرے۔

ایک دن عبدالحنان نے راحت علی کی موجودگی میں مذاق مذاق میں یہ ذکر چھیڑا تو رضیہ نے ساجدہ کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے بولی "نہ جانے اس روز اسے کیا ہو گیا تھا۔ ویسے تو وہ ایسی سیٹے دیئے رہنے والی لڑکی ہے کہ مجھ جیسی پرانی اور پکی سہیلی نے بھی اس کی زبان سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی۔ بس یہ ڈر لگتا ہے کہ سنا ہے اس روز پہلے تو راحت بھائی چپ چاپ بیٹھے کنگن کھاتے رہے مگر اچانک اس کی کلائی

ہاتھ مارا تو چوڑیوں کی کرچیاں اس کی جلد میں اتر گئیں۔ میں جب مکلاوے پہ جہلم گئی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر تک نوبت پہنچی ہے۔ اور وہ روزانہ پنسلین کے ٹیکے لے رہی ہے۔ ساجدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ رشتہ اسی چوڑی توڑ کی طرف سے آیا ہے۔ تو میں اسے کیسے یقین دلاؤں گی کہ راحت بھائی ویسے بہت بھلے آدمی ہیں۔"

"میں بے چارہ شہری آدمی" راحت علی نے اپنی صفائی پیش کی۔

"مجھے کیا معلوم کہ "بیڑی گھوڑی" کس بلا کا نام ہے۔ اور گھی لگے کوڑے کیسے الٹے جاتے ہیں۔ حنان نے مجھے ذرا سا بتایا تو تھا مگر مجھے اس انتہا کی خبر نہ تھی۔ اس نے تو میرے ہاتھ کی ہڈیوں پہ بھی گومڑ ڈال دیئے تھے۔ اب تک ہاتھ سیدھا نہیں ہوتا خدا کی قسم۔ میں اس خیال سے چپ چاپ بیٹھا چوٹیں سہتا رہا کہ شاید مجھے انجان سمجھ کر اسے رحم آجائے۔ پھر جب محسوس کیا کہ ہاتھ بالکل پھوڑا ہو رہا ہے۔ تو میں نے بالکل اندھوں کی طرح اس کی کلائی پکڑ لی۔ آپ ہی بتائیے بھابی میں کیا کرتا، اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"میں جانے مجھے کیا ہو گیا تھا حنان۔" بعد میں اس نے عبدالحنان کو بتایا تھا!

"وہ تو مجھے خدا کا شکر بجا لانا چاہیئے کہ ساجدہ کی کلائی پہ ہاتھ پڑنے سے اس کی چوڑیاں ٹوٹیں تو میری آنکھیں کھلیں۔ اگر چوڑیاں نہ ٹوٹتیں تو قسم کھا کر کہتا ہوں۔ خدا جانے میں کیا کر بیٹھتا۔ وہ کنگن میرے ہاتھ پہ مارتی تھی اور چوٹ میرے

دل پہ پڑ تی تھی۔ اور پھر یہ بھی شکر کرو کہ میں نے اُسے چھو لیا۔ میں ایسا نہ کرتا تو خدا کی قسم، بچوں کی طرح رونے بیٹھ جاتا۔ درد کی وجہ سے نہیں۔ جانے کس وجہ سے۔ بس مجھے رونا آ جاتا۔ عورتوں کے سامنے رونا آ جاتا۔"

عبدالحنان اور اس کی بیوی جب بھی جہلم گئے، ساجدہ کے والدین سے ضرور ملے۔ راحت علی کے خاندان، جائیداد اور آمدنی کی تفصیلیں بھی مہیا کرتے رہے۔ رضیہ نے حنان کو یہ بھی بتایا کہ جب ایک بار اس نے ساجدہ سے یہی ذکر چھیڑا تو وہ بالکل گلابی ہو گئی اور پھر بولی " ہائے اس روز مجھے بھی تو وہ کچھ ایسے بُرے نہیں لگے تھے۔" راحت علی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے خاندان کا واحد فرد تھا۔ اس لیے آخر میں رضیہ کے کہنے پر اس نے کہیں سے دور دراز کی ایک خالہ کا بھی سراغ لگا لیا جو عبدالحنان اور رضیہ کے ہمراہ جہلم جا کر بات پکی کر آئی اور تین مہینے بعد کی ایک تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

شادی کے دن لڑکیوں نے راحت علی کو خوب بنایا مگر وہ احمقوں کی طرح چپ چاپ بیٹھا مسکراتا رہا۔ جہلم ہی سے اس کے لئے ایک شرمالا ڈھونڈ نکالا گیا جس نے ساجدہ کی خاص سہیلی زرینہ کے ہاتھوں چاندی کے ٹھوس کنگن کی تین چار چوٹیں کھانے کے بعد راہِ فرار اختیار کر لی اور لڑکیوں کو للکارتا ہوا ایک کھڑکی میں سے کودا تو ایک انگلی تڑوا بیٹھا مگر اس نے پھر

سے پکڑ کر لا بٹھایا گیا اور اس کے زخم پر نمک چھڑک کر اس پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس پر وہ گالیوں پر اتر آیا مگر راحت علی مسکراتا رہا اور ننگی ننگی گالیوں بھرے گیت سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار ساجدہ سے تنہائی میں ملے گا تو اس کی کلائی پر سے ٹھوس سونے کے کنگن اتار کر، جو اس نے ساجدہ کے لیئے بڑے شوق سے بنوائے تھے۔ اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دے گا اور کہے گا: "لو مجھ فرض کر دو کہ میں بھی لنگا کوڑا مٹنے لگا ہوں" مگر ساجدہ اس کے سامنے بار بار زخمی کلائی کو بائیں ہاتھ میں لے کر تیچھے ہٹتی ہوئی ڈرتی رہی اور وہ سوچتا رہا کہ وہ اس کی کلائی پر کہاں کہاں پیار کرے گا۔ اور اگر کلائی پر چوڑیاں ہوئیں تو انھیں کتنی نرمی سے ادھر ادھر ہٹا کر اپنے ہونٹوں کے لیئے جگہ بنائے گا۔

شادی کے بعد راحت علی کو ساجدہ کے ساتھ صرف دو دن گزارنے کا موقعہ ملا مگر ان دو دنوں میں اس کی کیفیت ایسی رہی جیسے وہ اعصاب زدگی کا پرانا مریض ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اور ہتھیلیاں اور تلوے ہر وقت پسیجے رہتے تھے۔ عبدالحنان نے اسے سمجھایا بھی کہ دولہاؤں کے یہ تیور نہیں ہوتے مگر راحت علی بڑبڑاتا میں کیا کروں حنان میں ابھی تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پایا کہ میں اس لڑکی سے پیار کروں یا اس کی پوجا کروں۔ یا اس سے نفرت کروں۔ وہ جس نے میرے ہاتھ کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں،

اب دلہنوں کی روایتی حیا میں یوں لپٹی لپٹائی پڑی ہے کہ جب چاہوں اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لوں۔ نہ وہ ہاتھ جھٹکتی ہے نہ پاؤں پٹختی ہے بس دو مرحلے باقی ہیں۔ میں اس کے حسن کو ہضم کرلوں اور وہ اپنی حیا کو ہضم کرے۔ پھر تمہیں سچ مچ کا دولہا بن کر بھی دکھا دوں گا۔ لیٹ ہو جاؤں گا۔ مگر لیٹ گاڑیاں بھی تو منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہیں۔"

عبدالحنان نے یہ باتیں سن کر ایک مبہم احمقانہ قہقہہ مارا تھا اور چلا گیا تھا۔

اسی وقت ساجدہ کا بھائی آپہنچا تھا اور اب وہ مکلاوے پر جہلم جا رہے تھے۔ راستے میں وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کر سکے تھے کیونکہ ساجدہ کا بھائی قریب ہی بیٹھا تھا۔ بس راحت علی، ساجدہ کو دیکھتا رہا اور ساجدہ ایک رسالے کے پیچھے چھپی بیٹھی لجاتی اور خوش ہوتی رہی پھر جب بھائی تازہ ہوا کی خاطر پرلی طرف کی کھڑکی کے پاس جا بیٹھا اور گاڑی جہلم کے پُل پر سے گزرنے لگی تو ساجدہ نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور پُل کی گرج کو ایک لمحہ کان دھر کر سننے کے بعد اس نے کہا۔ "ارے! ایسا لگتا ہے کہ پل 'جہلم جہلم جہلم' پکار رہا ہے۔" اس پر راحت علی نے کہا "تمہیں اپنے میکے جانے کا کتنا شوق ہے بجو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان دنوں میں بھی تمہارے میکے ہی میں ہونگا پر ایسا لگتا ہے کہ تمہارے ماں باپ دو تین دن کے لئے تمہیں مجھ سے چھینے لے رہے ہیں۔ سچ کہتا ہوں بجو۔ میں نے تو ابھی تمہیں جی بھر کر دیکھا ہی نہیں

تمہیں کیا پتہ کہ میرے ہاتھوں کی ہڈیاں تمہارے کنگنوں کی چوٹیں کھانے کے لیے کتنی مدت سے کس قدر بے قرار ہیں۔ مگر میں تمہارے انتظار میں اتنی مدت تک جاگتے رہنے کے بعد ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ تمہارا بھائی تمھیں لینے آ گیا۔ بات سنو۔ یوں کریں کہ جہلم میں اتریں ہی نہیں۔ پنڈی کی طرف بھاگ جائیں۔"

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی وہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی۔ غرور بھی تھا اور اس شکاری کی سی خود آسودگی بھی جو ہرن کو جال میں پھنسا دیکھ کر اُسے جال میں سے نکالنے اور ذبح کرنے سے پہلے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگتا ہے۔

جہلم میں دو روز کے قیام کے بعد ساجدہ پہلی بار راحت علی سے تنہائی میں ملی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں گلی کی طرف کھلنے والے دروازے کو نیم وا کیے، بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ساجدہ نے آتے ہی گلی والا دروازہ بند کر دیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو راحت علی چونکا چونکا سا نظر آنے لگا اور بولا۔ "کیا بات ہے؟"

ساجدہ کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بھوبل سا بکھیر کر بجھ گئی۔ اب راحت علی کے بجائے وہ خود چونکی چونکی نظر آنے لگی اور بولی "کیوں کیا

بات ہے؟"

راحت علی نے جیسے سمجھ لیا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ ساجدہ کچھ اس طرح حیران اور اداس کھڑی رہ گئی جیسے وہ دودھ کا ایک پیالہ رکھ کر پل بھر کے لیے اندر گئی ہو مگر واپس آئی ہو تو بلی سارا دودھ پی چکی ہو۔ پھر وہ بہت دور سے آنے والی آواز میں بولی۔ "وہ میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ امی اور ابا نے اجازت دے دی ہے اور ہم آج شام کی گاڑی سے لاہور جا رہے ہیں۔"

راحت علی نے اسی طرح ٹہلتے ہوئے اور ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "رکنا چاہو تو دو چار دن اور رک جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور ساجدہ پر کچھ ایسا گومگو کا عالم طاری ہو گیا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اپنے دولہا کی اس فراخ دلی پر خوش ہو کر اندر بھاگ جائے یا بڑھ کر اس کا منہ نوچ لے۔ وہ ایک لمحہ دم بخود کھڑی راحت علی کو دیکھتی رہی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر اسے اکٹھا بہت سارا رونا آ گیا وہ پلنگ پر ذرا سا ٹک گئی اور راحت علی کے سینے پر سر رکھ کر اور بازوؤں کو اس کے شانوں پر ڈال کر بولی۔ "نہیں راحت آج ہی چلیں گے اور شام ہی کی گاڑی سے چلیں گے۔"

"بہت اچھا۔ چلو۔" راحت علی ساجدہ کے بازوؤں کا حلقہ توڑ کر

کھڑے ہوتے ہوتے بولا، مگر یوں بولا جیسے اگر نہ بولتا تو پھڑک کر مر جاتا۔

وہ اسی روز جہلم سے چلے آئے۔ پھر کوئی ایک مہینہ بعد جب جہلم میں ساجدہ کی امی اور ابا اور دوسرے گھر والے بیٹھے اس موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ لڑکیاں بیاہے جانے کے بعد یکایک اپنے برسوں کے گھر سے جدا ہو کر اسے یکایک کیسے بھول جاتی ہیں۔ تو یکایک ساجدہ آئی اور اپنی ماں سے لپٹ کر بچوں کی طرح سسکنے لگی۔ سب لوگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ پھر ساجدہ کے ابا کچھ کہے بغیر باہر لپکے کہ راحت علی کو بھی اندر لے آئیں مگر وہاں راحت علی کے بجائے اس کا ملازم ایک بکس لئے کھڑا تھا۔ اس نے سلام کر کے بکس ان کے حوالے کیا اور رٹا ہوا فقرہ طوطے کی طرح دہرا دیا:۔

"صاحب نے سلام بولا ہے اور بولا ہے کہ بیگم صاحب اپنی مرضی کا مالک ہے اور ہم اس کے ساتھ زور آوری کیسے کر سکتا ہے؟"

ایک دم ساجدہ کی رشتہ داروں اور سہیلیوں سے بھرا ہوا پورا محلہ امڈ آیا۔ رات گئے تک بات بات پر ناکوں پر انگلیاں رکھی جاتی رہیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور بھویں اچکا اچکا کر ٹھنڈی سانسیں بھری جاتی رہیں۔ آخر کار ساجدہ کی امی سے سینہ بہ سینہ چلتا ہوا یہ راز پورے ہجوم میں یوں عام ہوا کہ راحت علی تھوڑا سا پاگل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم خوبصورت تو ہو

مگر صرف خوبصورت ہو۔ تمہاری خوبصورتی دبدبے سے خالی ہے
"یہ دبدبہ کیا ہوتا ہے بہن؟" بتانے والی سے کسی نے پوچھا۔
اور وہ بولی "یہ بھی ہوتا ہے۔ پر یہاں نہیں ہوتا۔ اُدھر بڑے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔" پھر اس نے راحت علی کے پاگل پن کی وضاحت جاری رکھی۔" وہ کہنے لگا ساجدہ بی بی سے کہ میں تمہیں دور سے دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا۔ میں سمجھا تھا تم جیتا جاگتا سانپ ہو پر تم تو رسّی نکلیں۔"
"ہائے یہ کہا اس نے؟ یہ کیا کہا اُس نے؟" کسی نے پوچھا۔
اور بتانے والی بولی "اے میں کوئی پاگل ہوں کہ پاگلوں کی باتوں کا مطلب بتاتی پھروں۔ ہاں تو پھر بہن پھر بی بی کہہ رہی تھیں کہ کل تو غضب ہو گیا۔ کل جب ساجدہ نے سوتے ہوئے راحت علی کو یونہی ذرا سا چھو لیا تو اس نے ساجدہ کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا تھپّڑ دے مارا اور پکارنے لگا کہ تم صرف خوبصورت ہو۔ تم صرف ایک عام سی عورت ہو۔ شادی سے پہلے میں نے تمہارے حسن کے ہاتھ میں جو تلوار دیکھی تھی۔ وہ کہاں ہے؟ جاؤ۔ اپنے آپ کو میری نفرت سے بچائے جاؤ۔"
"پاگل ہے۔ صاف پاگل ہے۔" کسی نے کہا۔
"بدتمیز ہے وحشی ہے درندہ ہے۔" زرینہ وہیں ساجدہ کے گھٹنے کے پاس بیٹھی ہوئی چلا اٹھی "ہائے سچ۔ قسم پروردگار کی۔ میں تمہاری

جگہ ہوتی تو اُسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی ساری میں پوچھتی ہوں اس نے تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تو کیا تمہارے ہاتھ پر فالج گر گیا تھا؟ جواب میں تم اسے تھپڑ مارنے کے بجائے رونے لگیں اور پھر میکے بھاگ آئیں۔ میں ہوتی تو قسم پروردگار کی۔ اسے دونوں کانوں سے پکڑ کر ہلاتی اور پوچھتی کہ کیوں میاں۔ اب بتاؤ۔ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔" پھر ذرا سانس لے کر بولی۔ "دو کمینہ۔"

دو روز بعد جب سارا گھر صحن میں بیٹھا اس خاندانی المیئے پر بات چیت کر رہا تھا۔ یکایک راحت علی اندر آیا اور السلام علیکم کہہ کر ایک کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ ہفتوں سے یہیں مقیم ہے اور ابھی کچھ دیر پہلے یونہی ذرا ہوا خوری کو نکل گیا تھا۔ وہ بیٹھا تو بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے اور ساجدہ اندر بھاگ گئی۔

کم و بیش ایک ہفتے تک راحت علی سب کو یہ یقین دلانے میں مصروف رہا کہ ساجدہ اسے غلط سمجھی ہے اور اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کا قصہ یہ ہے کہ وہ سینے پر دونوں ہاتھ رکھے گہری نیند سو رہا تھا جب اچانک ہڑبڑا کر اٹھا اور اس کا الٹا ہاتھ ساجدہ کے منہ پر جا لگا۔ اگر پلنگ کی دوسری پٹی پر کوئی اور بیٹھا ہوتا تو دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر پڑتا اور اس حادثے میں اس کی نیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سب گھر والے راحت علی کی

ان مسلسل وضاحتوں سے متاثر ہو چکے تھے۔ اور اب تو زرینہ اور دوسری سہیلیاں جب ساجدہ کے رخسار پہ ہاتھ پھیر کر اس کے ساتھ بناوٹی ہمدردی کرتی تھیں تو ساجدہ بھی ہنس دیتی تھی اور کہتی تھی "اللہ کرے تمہیں بھی ایسے خوش نصیب ہوں کہ سوتے میں گھبرا کر اٹھیں تو بے خیالی میں تمہارے گالوں پہ گھونسے دے ماریں" سہیلیاں ہنستیں اور راحت علی اپنے کمرے کا گلی میں کھلنے والا دروازہ نیم وا کئے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہتا۔ سہیلیاں اب راحت علی کو بھی چھیڑنے لگی تھیں۔ اور زرینہ کہیں سے ایک کھلونا لے آئی تھی۔ یہ کھلونا ایک گڈے اور گڑیا پر مشتمل تھا۔ کھلونے میں کوک بھر کر اسے ہتھیلی پہ رکھ لیا جاتا تو گڈا بیٹھے بیٹھے یکایک اٹھتا اور ہاتھ بڑھا کر گڑیا کے منہ پہ طمانچے مارنے لگتا اور گڑیا دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر اپنے جسم کو یوں جھٹکے دیتی جیسے رو رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد گڈا بیٹھ جاتا اور گڑیا حیران کھڑی رہ جاتی۔ اس پر سارے گھر میں خوب قہقہے پڑتے اور جب ایک روز راحت علی نے زرینہ کے ہاتھ سے یہ کھلونا چھیننا چاہا تو زرینہ کی کلائی کی ایک چوڑی ٹوٹ کر اس کی ہتھیلی میں کھس گئی۔ وہ ہاتھ کو گھٹنوں میں دبا کر بیٹھ گیا تو زرینہ بولی "میں ساجدہ نہیں ہوں مسٹر۔ میں تو زرینہ ہوں۔ اور میری چوڑیاں تو ان ہاتھوں کو ڈس لیتی ہیں جو انہیں توڑنا چاہتے ہیں"

پھر ایک روز جب رات کے گیارہ بجے تک کیرم اور تاش کھیلنے

کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں آ گئے تھے اور ساجدہ کی سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں تو ایک بجے کے قریب بڑے دروازے پر مسلسل دستک ہونے لگی۔ معلوم ہوا زرینہ کی امی اپنے ملازم کے ساتھ زرینہ کو لینے آئی ہیں۔ "زرینہ تو یہاں سے گیارہ بجے ہی چلی گئی تھی۔" سب لوگ پکارے اور زرینہ کی ماں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہیں دروازے پر بیٹھ گئیں۔ سارے گھر میں بھگدڑ مچ گئی۔ پھر کسی نے آکر اطلاع دی کہ راحت علی بھی اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ اور اس کے کمرے کا گلی والا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہے۔ ایک لمحے تک سب پھر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے اور پھر سب ایک دم راحت علی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ وہاں پہنچ کر وہ پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے مگر پھر ساجدہ نے بے ہوش ہو کر سارا معمہ حل کر دیا۔

فوراً زرینہ کے نوجوان رشتہ دار ایک کار میں ٹھنس ٹھنسا کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور ساجدہ کے ابا نے عبدالحنان کو تار بھیجا کہ فوراً پہنچو۔ مگر جب تک یہ معمہ حل ہوتا، راولپنڈی سے اپنی امی کے نام زرینہ کا خط آ چکا تھا۔ کہ ہم بخیریت ہیں۔ اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ ہمیں معاف کر دیجئے۔ چھوٹے غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور بڑے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اور آپ ہمیں معافی کی

چیٹھی لکھ دیں تو ہم دونوں آپ کی قدم بوسی کے لئے فوراً حاضر ہو جائیں گے۔

راحت علی جب ساجدہ کو مکلاوے پر جہلم لایا تھا۔ اور سسرال میں اپنی بہت سی نئی رشتہ داروں اور ساجدہ کی سہیلیوں میں گھرا ہوا صوفے پر جاکر بیٹھا تھا۔ اور سامنے دیکھا تھا تو یکایک اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے ساجدہ سے شادی کر کے جھک ماری ہے۔

یہ کون ہے؟ اس نے سوچا تھا۔ یہ جو ساجدہ کے بالکل اُلٹ ہے لیکن پھر بھی خوبصورت ہے جس کی نسوانیت میں مردانہ وجاہت ہے اور جس کا رنگ اتنا ملیح ہے کہ زبان تک کو اس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے جس کی آنکھیں صرف اتنی بڑی ہیں کہ اس سے بھی بڑی ہوں تو مصنوعی معلوم ہوں۔ ہر پلک ہلال کی طرح خمیدہ ہے۔ خوب گہری اور جڑی ہوئی بھویں ہیں۔ بظاہر موٹی سی گول سی ناک ہے۔ لیکن اگر اس چہرے پر ساجدہ کی سی ناک ہوتی تو پورے چہرے کا ناس مار دیتی۔ بھرے بھرے ہونٹ ہیں جن کا رنگ سنہری مائل سرخ ہے۔ جیسے بہت سا زہر آلود خون پڑے پڑے جم گیا ہو۔ عزم سے بھری ہوئی ٹھوڑی ہے۔ گردن میں نیلی نیلی رگیں ہیں۔ اور جسم کے خطوط میں رعنائی بھی ہے۔ اور توانائی بھی، یعنی ایک ایسا بھرپور پن جس کی وجہ سے سارا جسم کسا کسا نظر آتا ہے۔ راحت علی نے سوچا تھا کہ اگر میں مصور ہوتا تو اس لڑکی کی تصویر کھینچ کر اس کے

نیچے" جو آنکھ دیتا۔

ایک ساتھ سب نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کی طرف راحت علی مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ پھر وہ بولی تھی۔ "ہائے دولہا بھائی تو مجھے بالکل ندیدوں کی طرح دیکھے جا رہے ہیں۔"

"ہائے زرینہ" کوئی بڑی بی بولی۔ "گالی مت بکو۔"

"گالی مت بکو زری"۔ راحت علی نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہیں اپنا ایک خیال بتا رہا تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کی ساری عورتیں، چاہے وہ ساجدہ ایسی ہوں، چاہے زرینہ ایسی، جب بیوی بن کر مرد کے قریب آتی ہیں تو اپنی شخصیت کے خول میں سے نکل آتی ہیں۔ اور سیدھی سادی عام عورتیں بن جاتی ہیں۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ساری دنیا میں صرف ایک عورت بستی ہے۔ البتہ ہر گھر میں اس کا نام مختلف ہے۔"

"وہ پھر وہی بک بک!" زرینہ کڑک کر بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ زرینہ کے نام اس کی امی کا خط آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماؤں کی طرح انہوں نے بھی یہ رسمی گوالی آنکھیں بند کر کے نگل لی تھی۔ انہیں فوراً جہلم بلا بھیجا تھا۔ اور یہ فرمائش بھی کی تھی کہ آتے ہوئے میرے لئے مری کی تین چار باسکٹیں بھی لیتی آنا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے" راحت علی نے کہا۔ "کہ تمہاری امی ہم سے نہ صرف خفا نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں۔"

"خوش کیوں نہ ہوں" زرینہ بولی۔ "میں نے انھیں باقاعدہ شادی کے دس ہزار کے خرچے سے بچایا ہے کہ نہیں؟"

دوسرے دن دوپہر کو دونوں جہلم پہنچے تو زرینہ کی ماں دس منٹ تک زرینہ کو سینے سے لگائے روتی رہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے راحت علی کے سر اور پیٹھ پر تین چار بار ہاتھ پھیرا اور اس کا کندھا چوما۔ پلٹ کر وہ زرینہ سے لپٹ گئیں۔ اور راحت علی نے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنی سامنے کی جیب میں سے کنگھی نکالی اور بال سنوارنے لگا۔

ایک دم اکٹھی بہت سی پڑوسنیں قطار اندر قطار صحن میں آمڈ پڑیں۔ اور زرینہ، اس کی امی اور راحت علی ان میں گھر کے رہ گئے۔ بیشتر عورتیں انھیں یوں حسرت سے دیکھے جا رہی تھیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر کے لوٹے ہیں۔ اِکا دُکا نوجوان لڑکیوں نے راحت علی سے چھیڑ چھاڑ کی بھی کوشش کی اور بعضوں نے اپنی چوڑیوں بھری کلائیاں بھی اس کے سامنے یہ کہہ کر پھیلا دیں کہ شاید دولہا میاں کے بت میں اسی بہانے کوئی حرکت پیدا ہو۔ مگر زرینہ قہقہے لگاتی رہی اور راحت علی یوں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جیسے اس کے سامنے عورتیں نہیں کھڑی ہیں "پیڑی گھوڑی"

رکھی ہے۔

ادھر زرینہ کی امی اپنی ہم سنوں کو بتا رہی تھیں "بہنا۔ بھاگی سب ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ زرینہ چھپ کر بھاگی تھی۔ اور ساجدہ دن دھاڑے ڈھول بجا کر بھاگی تھی، راحت پھر تو دس ہزار ہی تو ہے میں کہتی ہوں پھر بی بی کو بلا بھیجو۔ میں ابھی اسی وقت اس کے ہاتھ میں سو سو روپے کے سو نوٹ نہ تھما دوں تو زرینہ کی ماں نہیں۔"

راحت علی کے چہرے پر اچانک ایک عجیب سا رنگ آ گیا۔ ایک ایسا رنگ جس کا کوئی نام ابھی تک تجویز نہیں ہوا جیسے مٹی اور ہلدی اور خون اور زہر کو آپس میں ملا کر رل دیا جائے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سامنے دیکھنے لگا۔ پھر سب نے پلٹ کر اس طرف دیکھا اور سب کے چہروں پر مٹی اور ہلدی اور خون اور زہر کے رنگ بکھر گئے۔ سب نے جیسے کسی غیر شعوری حکم کی تعمیل میں ادھر ادھر ہٹ کر راحت علی تک ساجدہ کے لئے راستہ بنا دیا۔

ساجدہ کے ساتھ صرف ایک عورت تھی۔ جو شاید گھر کی ملازمہ تھی۔ ساجدہ نے نقاب الٹ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ فق تھا۔ ہونٹ سختی سے بھینچ کر غائب سے ہو گئے تھے اور وہ کچھ یوں چل رہی تھی۔ جیسے سر سے پاؤں تک شدید تشنج میں مبتلا ہے۔

وہ آنکھیں جھپکے اور ادھر اُدھر دیکھے بغیر، سیدھی راحت علی کی طرف آئی۔ اس کے قریب آکر رُک گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اُسے دیکھنے لگی اور پھر ایک دم، جیسے کوک بھری مشین کی طرح اُس نے دونوں ہاتھوں سے راحت علی کے منہ پہ تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ راحت علی بازو لٹکائے یوں چپ چاپ کھڑا رہا جیسے ساجدہ کی چوڑیوں کے چھناکے سن رہا ہے۔ پھر اچانک اس کے جسّے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے ساجدہ کی چوڑیوں بھری کلائی دبوچ لی۔ کانچ کی چوڑیاں چھنک کر ٹوٹیں اور ہر طرف سرخ اور سبز بلوریں ٹکڑے خون اور زہر کے قطروں کی طرح بکھر گئے اور ساجدہ کی کلائی کے خون سے راحت علی کی اُنگلیاں بھیگ گئیں۔ ساجدہ دیوانوں کی طرح راحت علی پہ جھپٹی اور اس کے ہاتھ میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ اور جب راحت علی کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے خون کی ایک دھار اس کی کہنی تک بہہ آئی تو زرینہ ہکا بکا عورتوں کو چیرتی ہوئی آئی اور ساجدہ کو کندھے سے جھٹک کر چیخی "یہ کیا بکواس ہے؟"

ساجدہ نے راحت علی کے ہاتھ پر سے ہونٹ ہٹا کر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی کلائی چھڑائی اور اپنے دانتوں پہ پھیلا ہوا راحت علی کا خون زرینہ کے منہ پہ تھوک دیا۔ زرینہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی اور ساجدہ واپس جانے کے لئے

پلٹی ہی تھی کہ اندر کمرے میں سے زرینہ کی امی سو سو کے سو نوٹ ہاتھ میں لیئے ہوئے چیختی چلاتی باہر نکلیں اور پکاریں۔ "یہ لے اپنا دس ہزار کا حق مہر جس کی خاطر تو میری بیٹی کو کاٹتی پھر رہی ہے۔ میں تو تجھے تیرے ہوتوں سوتوں سمیت قربان کر ڈالوں اس جوڑے پر سے۔"

ساجدہ نے جس کے ہونٹ راحت علی کے خون سے سرخ ہو رہے تھے، ذرا سا رک کر زرینہ کی امی کی طرف بے پناہ نفرت سے دیکھا اور پھر رستہ بناتی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں سے گزر کر باہر چلی گئی۔

"لائیے امی۔ مجھے دے دیجئے۔" راحت علی نے زرینہ کی امی کی طرف اپنا زخمی ہاتھ بلند کیا۔

"یہ لے بیٹا" انھوں نے نوٹوں کا پلندہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ روپے آپ نے مجھے دیئے ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں بیٹا۔" وہ بولیں۔

اور راحت علی نے یہ پلندہ روتی ہوئی زرینہ کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ "وہ تو میں نے آپ کی بیٹی کو دیئے۔"

یہ کہہ کر وہ یوں باہر لپکا جیسے ذرا سا بھی رک گیا تو اسے بہت دیر ہو جائے گی۔ زرینہ نے یہ دیکھا تو کھڑی ہو گئی اور آنکھیں پھاڑ کر اسے جاتا دیکھنے لگی، اور اس کی امی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رو رہی تھی

ہوئی ؛ ہیں بیٹھ گئیں ۔ مگر راحت علی لپکا چلا گیا ۔ وہ باہر سڑک پر آگیا اور بھاگنے لگا ۔ دور ایک تانگے میں ساجدہ کے ابا ، اس کا بھائی اور عبدالحنان اس کی طرف آ رہے تھے ۔ مگر وہ انھیں نہ دیکھ سکا ۔ وہ تو صرف ساجدہ کو دیکھ رہا تھا ۔ جس سے اب ، وہ صرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا ۔

(جولائی ۱۹۶۰ء)

شیش محل

"شرم کرو بشکو"

یہ الفاظ ملک کرم الٰہی کا تکیہ کلام بن چکے تھے۔ مر رہا ہے یا چوپال پر جنازے میں یا شادی پہ، جہاں بھی ان کی مڈبھیڑ اللہ بخش موچی سے ہوتی۔ ان کی بھویں سکڑ جاتیں اور وہ کہتے "شرم کرو بشکو۔ ماشاء اللہ تم اتنے بڑے کاریگر ہو، ہر سال ڈھائی تین سو روپے کما لیتے ہو مگر سر چھپانے کو چھونس کا ایک چھپر بھی نہیں بنوا سکتے۔ کبھی ایک کے گھر ٹِکے، کبھی دوسرے کی چوکھٹ پہ۔ شرم کرو۔"

"شرم تو بہت آتی ہے ملک جی" اللہ بخش نے ہاتھ مروڑتے ہوئے ایک روز کہہ ہی ڈالا۔ "پر کیا کروں، سال نہیں گزرتا کہ بچہ ہو جاتا ہے گنتی بھول جاتا ہوں پیر دستگیر کی قسم"

ملک کرم الٰہی پوچھنا تو یہ چاہتے تھے کہ پھر تم اتنے بڑھیا کپڑے کیوں

پہنتے ہوں مگر جب بھی یہ خیال ان کے ذہن میں آیا، ساتھ ہی یہ خیال بھی آ گیا کہ اگر اللہ بخش کو اس کے اچھے لباس پر ٹوکا گیا تو وہ سمجھے گا، ملک جل گیا ہے۔ اسی لئے انہوں نے اللہ بخش پر ایک اور رخ سے حملہ کیا: "اچھا بتا۔ کتنے بچے ہیں تیرے؟"

اللہ بخش انگلیوں کی پوروں کو انگوٹھے سے چھوتے ہوئے گننے لگا

"پھلاں، لطو، بھرائی، ستاں، زبیدہ۔"

"زبیدہ؟" ملک کرم الٰہی کے تیور کچھ ایسے ہو گئے جیسے دودھ میں مکھی گر پڑی ہو۔ "ارے تیری ایک بیٹی کا نام زبیدہ بھی ہے؟"

اللہ بخش کھسیا کر مسکرا دیا "آپ کی موچن جانے کہاں سے اچھے اچھے شہری نام سن آئی۔ یہ لڑکی ہوئی تو میں نے اس کا نام بانو رکھا پر اس نے زبیدہ پکارنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا زبیدہ ہے تو زبیدہ ہی سہی اپنا کیا بگڑتا ہے۔ تو وہ میں پانچ گن چکا تھا۔ چھٹا حفیظ اور ساتواں الطاف"

"حفیظ اور الطاف؟" ملک کرم الٰہی اب کے تو ہکا بکا رہ گئے "کیا یہ نام بھی بھاگی نے رکھے ہیں؟"

"جی نہیں۔ یہ تو میں نے رکھے ہیں۔" اللہ بخش بچوں کی طرح شرما گیا۔

"حفیظ پٹواری اور الطاف تھانیدار کے نام پر۔"

"بڑا شوق ہے بڑا آدمی بننے کا۔" ملک صاحب بولے "پڑھے

آدمیوں کے تو اپنے مکان بھی ہوتے ہیں نا۔" یکایک انہیں جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "اچھا بتا، تیری شادی کو کتنے سال ہوئے؟"

اللہ بخش نے انگلیوں کی پوروں پہ پھر سے انگوٹھا چلایا اور بولا۔

"یہی کوئی دس ایک سال ہوئے ہوں گے۔"

ملک کرم الٰہی نے جیسے اللہ بخش کو پکڑ لیا۔ "دس سال میں سات بچے بھی کوئی بچے ہیں؟"

"دو مر بھی چکے ہیں۔" اللہ بخش نے اطلاعاً کہا۔ پھر جیسے وہ اداس سا ہو گیا۔ بولا "دو اکٹھے پیدا ہوئے اور ایسے پکے دوست نکلے کہ اکٹھے مر گئے۔"

"حساب ان کا کیا جاتا ہے جو جی رہے ہیں۔" ملک کرم الٰہی بولے "کل سات ہوئے اور تم سوچ رہے ہو کتنے رہ گئے ہیں؟"

"کل نیز معدان سعد۔"

"کیا وہ تم سے بڑا کاریگر ہے؟"

"اسے تو ملک جی اب تک جوتا گانٹھنا بھی نہ آیا۔"

"پھر کیا وہ مانگے کے مکان میں رہتا ہے؟"

اللہ بخش، ملک کرم الٰہی کو خالی خالی آنکھوں سے گھورتا رہ گیا۔

ملک صاحب بولے "اس کے تیرہ بچے ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی بھی

کر چکا ہے ۔ اس سے چھوٹی کا کام بھی تیار ہے ۔ اس کی موچن بھی آئے دن
بیمار رہتی ہے ۔ اور کماتا ہو گا مہینے میں یہی کوئی پانچ چھ روپے ۔ سال کے
ساٹھ ستر کر لو ۔ مگر اس کا اپنا مکان ہے ۔ اپنی دوکان ہے ۔ اور کوٹھے میں
جن کے دروازوں پر پکی اینٹوں کی ڈاٹ ہے ۔ سمجھے نا؟"

"جی ۔" اللہ بخش نے جواب دیا ۔

"شرم کرو لفنگو ۔" ملک صاحب نے بھویں سمیٹ کر کہا "اس کا اپنا
مکان اور اپنی دکان ہے ۔ اور تم اس تاک میں رہتے ہو کہ کوئی کسان باہر
کھیتوں میں اٹھ جائے تو تم مہینے دو مہینے کے لئے اس کے کوٹھے میں اپنا
سر چھپا سکو ۔ آج کل فصلیں کٹ رہی ہیں ۔ کچھ دنوں کے بعد فصلیں اٹھ جائیں گی
اور کسان واپس گاؤں میں آ جائیں گے تو تم اپنے اوزار سر پر رکھ کر اپنے
بچوں کا ریوڑ ہانک کر بھکاریوں کی طرح گھر گھر میں جھانکتے پھرو گے ۔ شرم کرو ۔"

اللہ بخش چھوٹا سا تھا جب اس کا باپ مر گیا ۔ ماں اس سے پہلے
مر چکی تھی ۔ ایک بیاہتا بہن تھی جو اسے سینے سے لگا کر اپنے ہاں لے
گئی ۔ اس کے شوہر نے ناک بھوں چڑھائی مگر جب اللہ بخش دوکان میں بیٹھ
کر پرانے جوتے گانٹھنے کا کام کرنے لگا تو اس نے سوچا کہ دو وقت کی روٹی
اور سال دو سال کی اترن پر یہ سودا کچھ ایسا مہنگا نہیں ۔ پھر ایک ساون
میں اللہ بخش کے مکان کی چھت گر پڑی تو گامی یوں روتی پیٹتی جیسے اس کے

ماں باپ کے جنازے جاتے جاتے اُلٹ پڑے ہیں۔ گامی کے شوہر نے اُسے سمجھایا کہ اللہ بخش ہونہار کاریگر ہے۔ جوان ہوگا تو نئی چھت ڈلوا لے گا۔ "اور گامی۔ اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟" دو تین سال بعد ایک اور ساون میں چھت سے محروم ننگی دیوار بھی بیٹھ گئی اور گامی نے دو ہتڑوں سے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔ شوہر نے اُسے سمجھایا کہ اگر چھتیں دیواروں کے سہارے کھڑی رہتی ہیں۔ تو دیواروں کو بھی چھتیں ڈھانپے رکھتی ہیں۔ چھت گرے گی تو دیوار بھی ڈھے جائے گی۔" اس لیے گامی اس میں رونے پیٹنے کی کون سی بات ہے؟"

اللہ بخش کبھی کبھار اپنے گھروندے کے کھنڈر کا بھی چکر لگا آتا۔ وہ صحن جو کسی زمانے میں چمڑے کی کترنوں سے اٹا رہتا تھا اب خودرو جھاڑیوں سے بھر گیا تھا۔ چھت کا صرف ایک حصہ دیوار سے اٹکا رہ گیا تھا ورنہ پوری چھت اندر کوٹھے میں ڈھیر پڑی تھی، اللہ بخش نے جب بھی یہ کھنڈر دیکھا، اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے ماں باپ کی دھنسی ہوئی قبروں کے پاس کھڑا ہے۔ ایک دن وہ اس کھنڈر کے بند دروازے سے لٹکے ہوئے کالے جھنگ تالے کو مٹھی میں پکڑے جھاڑیوں بھرے صحن کو گھور رہا تھا جب اوپر سے ملک کرم الٰہی آ گئے۔ اسے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا اور یوں اداس اداس کھڑا دیکھ کر

ملک صاحب نے اسے کہیں شادی کرنے اور اپنا گھر دوبارہ آباد کرنے کا مشورہ دیا۔ جب سے اللہ بخش کی کاریگری کی دھوم مچی تھی ملک کرم الہٰی اپنے گھر کے جوتے اسی سے بنواتے تھے اور اسے اچھی منصفانہ قیمت ادا کرتے تھے مگر یہ رقم اللہ بخش کے بہنوئی کی جیب میں اتر جاتی تھی اور اللہ بخش کی صرف اتنی مدارات ہوتی تھی کہ بہنوئی گامی سے کہہ دیتا تھا "ارے کسی دن بیٹھ کر لشکو کے کرتے کی مرمت کر دے۔ دیکھ تو جگہ جگہ سے کھل گیا ہے" گامی اپنے بھائی کا کرتا مرمت کرتی اور روتی اور کبھی کبھی چپکے سے اس کے کان میں کہہ دیتی "میرے ویر تیری جلدی ہی جلدی سے کہیں شادی ہو جائے۔ اور تو اپنا مکان کھڑا کرلے تو دیکھ۔ میں تیرے بہنوئی کو کیسے کیسے جلاتی ہوں۔" اس نے کئی بار اپنے شوہر سے بھی اللہ بخش کی شادی کا ذکر کیا مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ایسوں کو رشتے نہیں ملتے۔ اب ملک کرم الہٰی نے اللہ بخش سے یہی بات کی تو وہ بولا "میں کیا کر سکتا ہوں۔ ملک جی۔ میری کمائی تو بہنوئی لے جاتا ہے۔" ملک کرم الہٰی اسے ہاتھ سے پکڑ کر گامی کے گھر لے آئے۔ انہیں خوب بُرا بھلا کہا اور سمجھایا "بیوی تو مرد کی منہ زور جوانی کے منہ میں لگام ہوتی ہے اور تم نے لشکو کا جلدی سے کہیں رشتہ نہ کر دیا تو یہاں تمہارے پاس جوتیاں بناتے بناتے کہیں جوتیاں کھا بیٹھے گا۔" پھر انہوں نے ایک موچی کی لڑکی کا نام بھی لے دیا اور یہ حامی بھی بھر لی کہ :

خود جا کر اس سے بات کریں گے۔

اللہ بخش کی شادی پر نہ ڈھول بجے نہ شہنائی گونجی۔ گامی شور مچاتی اور ناچتی پھری اور یوں پانچ دن رونق میں گزرے۔ چھٹے روز صبح کو جب گامی دلہن کے ہاتھ منہ دھلا کر مہندی کا رنگ چمکانے کے لئے اس کے ہاتھوں کو گھی سے چپڑ رہی تھی تو اُوپر سے اس کا شوہر آ گیا۔ بات گھی کو باقی کی طرح بہانے سے چلی اور اللہ بخش کو گھر سے نکال دینے پر ختم ہوئی جب اللہ بخش سر پہ بکس اور بستر رکھے اور اس کی نئی نویلی دلہن گٹھڑی اٹھائے اس گھر سے نکلے تو گامی نے دروازے پہ کھڑے ہو کر دو ہتڑ دل سے اپنے شوہر کا ماتم کیا اور "میرے دیرا میرے دیرا" چلاتی ہوئی بے ہوش ہو گئی

پہلے روز اللہ بخش اپنی دلہن سمیت ملک کرم الٰہی کے مہمان خانے میں رہا۔ دوسرے دن ایک کسان کے گھر آ لیا۔ جب سے اب تک وہ پندرہ بیس مکان بدل چکا تھا۔ اس کے سات بچے بھی ہو گئے تھے۔ اس کی کنپٹیوں میں بھی ایک آدھ سفید بال نظر آنے لگا تھا مگر وہ اس تمام دوران میں اپنا مکان نہ بنوا سکا۔ وہ علاقے کا مشہور موچی تھا۔ جتے پر طلہ چڑھاتا تھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ انسان کی انگلیاں اتنا باریک کام بھی کر سکتی ہیں۔ پھر اس کے جوتے کی دیتر بھی بڑی مناسب ہوتی تھی اور آس پاس کے گاؤں کے سب کھاتے پیتے لوگ اس کے ہاتھوں کا بنا ہوا جوتا بڑے فخر سے پہنتے تھے

یوں اس کی آمدنی خاصی معقول تھی مگر ادھر رقم آئی تو ادھر وہ بزاز کی دکان میں گھس جاتا اور بیوی بچوں اور خود اپنے لئے ایسے کپڑے خریدتا کہ ملک کرم الٰہی تک کو سارے گھر کے لئے ایسا کپڑا خریدنے سے پہلے دس بار سوچنا پڑتا ہوگا۔ اچھا لباس اللہ بخش کی کمزوری تھی۔ وہ جب لیڈی ہملٹن کا تہمد باندھ کر، بوسکی کی قمیص پہن کر اور سر پہ ریشمی مشہدی لنگی سجا کر شملے سے چہرے کو کوٹتا یا گھٹنے پہ بٹیا رکھ کر طلہ چڑھاتا تو اسے دیکھ کر لوگ کہتے "اسے ترا کیا آتا ہے اتنا قیمتی لباس پہن کر۔ سارا دن تو ایک جگہ بیٹھا رہتا ہے!" مگر اللہ بخش یہ باتیں سن کر جی ہی جی میں ہنستا تھا اور شام کو بھاگی سے باتیں کرتے ہوئے کہتا تھا "جسے موچی کو دکان میں کام کرنا ہو تو اسے کپڑے اتار دینے چاہئیں۔"

اپنے مکان کی تعمیر سے وہ غافل نہیں تھا۔ کتنی بار میاں بیوی نے اس مسئلے پر باتیں کی تھیں اور ملک کرم الٰہی کے مشورے کے مطابق تہیہ کیا تھا کہ اب سے وہ کوڑی کوڑی بچائیں گے اور اپنے بزرگوں کے کھوڑ کو آباد کریں گے۔ مگر جونہی اللہ بخش کے پاس رقم آتی اس کی انگلیوں میں چل سی ہونے لگتی۔ وہ کہتا "تیرے لئے چکن کی پیسنی تو ضرور آنی چاہیئے" اور بھاگی بھی کہتی "لے آ تیری مرضی۔ اب میں تجھ سے کیا کہوں" یوں مکان بنانے کی نوبت کبھی نہ آئی اور ملک کرم الٰہی نے تو مایوسی کے عالم میں چوپال پر اعلان کر دیا تھا کہ "جس دن بشکو اپنا مکان بنائے گا اس دن قیامت آ جائے گی دیکھ لینا۔"

"شرم کرو لشکو"۔ وہ اللہ بخش کے ہاں جا کر بھی کہہ آئے "دو علاقے کے اتنے بڑے کاریگر ہو۔ ہر سال ڈھائی تین سو کما لیتے ہو مگر سر چھپانے کے لئے پھونس کا ایک چھپر بھی نہیں بنوا سکتے۔ کبھی ایک کے گھر میں، کبھی دوسرے کی چوکھٹ پر۔ شرم کرو۔" انہوں نے لباس کے سلسلے میں اللہ بخش کی فضول خرچی کا ذکر کبھی نہ کیا۔ ان کے ذہن میں وہی ڈر تھا کہ اگر وہ انہیں اس بات پر ٹوک بیٹھے تو میاں بیوی ہنسیں گے اور کہیں گے "ملک بیچارہ جل گیا ہے۔"

برس دو برس بعد کی بات ہے ایک شام اللہ بخش چوپال پر گیا اور ملک کریم الہی کے پلنگ کے پائے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز کچھ ایسے تھے جیسے قرض لینے آیا ہے۔ وہ ملک صاحب سے کبھی کبھار قرض لے لیتا تھا اور رقم ملتے ہی ادا بھی کر دیتا تھا مگر قرض آخر قرض ہے۔ ملک صاحب نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ پھر جب دیکھا کہ وہ وہاں سے اٹھتا ہی نہیں تو بولے۔

"آج کل کس کے گھر میں پڑے ہو لشکو؟"

"جی غفار تین مہینے کے لئے تھل چلا گیا ہے"۔ اللہ بخش بولا۔

"وہیں پڑا ہوں۔"

"اور اگر وہ کل ہی واپس آ گیا؟" ملک صاحب نے پوچھا "تو؟"

اللہ بخش خاموش رہا تو ملک صاحب بولے۔ "شرم کرو لشکو۔ شرم کرو——"

وہ اسے حسبِ عادت بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ جب اللہ بخش نے ان کے گھٹنے کو چھوا اور بولا "الگ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"یہیں مانگ لو۔ کتنے روپے چاہئیں؟" ملک کرم الٰہی بولے۔

"لیکن بے شرم کرو شکو۔"

"جی نہیں" وہ بولا "ایک اور کام ہے۔"

"اچھا!" ملک صاحب نے پاؤں لٹکا کر جوتا پہنا اور اندر چوپال کے کوٹھے میں چلے گئے۔ اللہ بخش نے ریشمی تہمد کا ایک "لڑ" کھول کر اس میں سے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا اور بولا "یہ تین سو روپے اپنے پاس امانت رکھ لیں۔ اگلے سال ڈھیری والے ملک نوزنگ کے بیٹے کی شادی ہے۔ اکٹھے بیس "طلے گج" پھوڑوں کے لئے کہا ہے۔ یہ تین سو روپے پیشگی دی ہے۔ میں نے کہا آپ کے پاس رکھ دوں۔ کچھ اور جمع ہو جائے تو مکان بنوا لوں گا۔"

"بسم اللہ" ملک کرم الٰہی نے روپے لے لیے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بولے۔ وہ اتنے خوش تھے کہ اس سے زیادہ بول بھی نہ سکتے تھے۔

ملک کرم الٰہی کے پاس یہ تین سو روپے تین سال تک جمع رہے مگر ان میں ایک روپے کا بھی اضافہ نہ ہو سکا۔ اللہ بخش مکان بدلتا رہا۔

خالص ریشم پہنتا رہا اور اولاد میں اضافہ کرتا رہا۔ ملک صاحب کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اللہ بخش ان کے پاس تین سو روپے جمع کر کے ان کی زبان کاٹ لے گیا ہے۔ وہ پچھلے تین سال میں ایک بار بھی اپنا تکیہ کلام استعمال نہیں کر پائے تھے بس اتنا کیا کہ جب اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی پر انہوں نے اللہ بخش سے جوڑے بنوالیے اور اللہ بخش ان سے اجرت وصول کرنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا" جا۔ نہیں دیتے۔" پھر وہ بولے" دو سو کی یہ رقم میں نے تمہارے تین سو میں جمع کر دی ہے اب تمہارے پانچ سو ہو گئے۔ چار پانچ سو اور جمع کر لو تو اکٹھے دے دوں گا مگر اس شرط پر کہ تم فوراً مکان بنوانا شروع کر دو گے۔ جاؤ۔"

کوئی ہفتہ بھر بعد اللہ بخش ملک کرم الٰہی کے پاس پانچ سو روپے لے آیا اور اپنے پانچ سو واپس مانگتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس نے مکان کی تیاری شروع کر دی ہے اور کل ہی سے اینٹوں کی ڈھوائی ہونے لگے گی "اینٹوں کی ڈھوائی؟" ملک کرم الٰہی حیران رہ گئے۔" دروازوں، کھڑکیوں کی پکی ڈاٹ کے لیے تو یہی کوئی سو دو سو اینٹ چاہیئے۔"

"جی میں پکا مکان بنواؤں گا۔" اللہ بخش بولا" بیچار دن کی زندگی ہے پھر عمر بھر ٹھٹک ٹھٹک کر یہ ٹھکانا بناؤں گا تو پکا کیوں نہ ہو۔ سو دو سو تین سو زیادہ لگ گئے تو کوئی حرج نہیں۔ ملک فتح علی کے دونوں بیٹوں کی اکٹھی

شادی ہو رہی ہے اگلے کاتک میں۔ سارے کام ہو جائیں گے۔"

ملک صاحب نے زبیدہ، حفیظ اور الطاف کے ناموں سے لے کر اللہ بخش کے ریشمی کپڑوں تک اپنے اندر جو لاوا جمع کر رکھا تھا وہ بہانے بہانے سے اُگل دیا۔ بولے۔ "بڑا الٹا دماغ ہے تمہارا۔ موچی ہو کر اولاد کے نام لاہوریوں کے سے رکھتے ہو۔ موچی ہو کر ریشم پہنتے ہو۔ اب موچی ہو کر پکا مکان بنواتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں علاقے بھر میں کسی بڑے سے بڑے موچی کا بھی مکان پکا ہے؟ پھر کیا تم نے اتنے روپے جمع کر لئے ہیں؟ یہ ایک ہزار تو بنیادوں کی اُسار ہی پر اُٹھ جائیں گے۔"

"بسم اللہ تو کر دوں ملک جی۔" اللہ بخش بولا "خدا برکت دے گا۔"

"مگر اپنے باپ دادا کی طرح تم کچے کوٹھے میں رہو گے تو کیا تمہارا دم گھٹ جائے گا؟" ملک صاحب کا لہجہ خاصا سخت ہو گیا۔

اللہ بخش بولا۔ "صرف بڑے لوگ تو پکے مکان اپنے نام لکھوا کر نہیں آئے ملک جی۔" یکایک وہ اپنے لہجے سے چونکا اور ہاتھ ملنے لگا "وہ میں نے عرض کیا ہے نا کہ چار دن کی زندگی ہے۔ موچی ہوں پر کماتا کھاتا ہوں۔ اب پھلا اور لطو بھی ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ پھلا تو ملک جی، پنے پر ایسے ایسے بیل بوٹے کاڑھتا ہے کہ موتی پرو دیتا ہے۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر ذرا سا مسکرا کر بولا۔ "آپ کی موچن تو کہہ رہی تھی کہ مکان کی

چھت پر چمنی بھی رکھیں گے جس میں سے بڑے لوگوں کے گھروں کی طرح دھواں بھی نکلے گا۔" ذرا سا رک کر بچوں کی طرح یوں بولا جیسے ملک صاحب پر کوئی انکشاف کر رہا ہے "کچے گھروں کا دھواں تو دروازوں میں سے نکلتا ہے"

ملک کرم الٰہی نے اسے پانچ سو روپے تو لاکر دے دیئے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "بشکو میری سن۔ کچا مکان بنوا لے، پکے کے لئے تو پکی آمدنی چاہیئے اور اب تو بوٹوں گر گابیوں کا زمانہ شروع ہو چکا ہے۔ یہ نہ ہو کہ آدھی آدھی دیواریں اٹھا کر بیٹھے رہ جاؤ۔"

"نہیں ملک جی" اللہ بخش بولا "آپ دیکھیئے تو سہی۔ دہ واڑوں پر سمینٹ لگے گا۔ چھت پہ شہتیر کی جگہ گاڈر چڑھاؤں گا رساخوں والی باریاں ہوں گی۔ روغن والے دروازے ہوں گے۔ آپ دیکھیئے تو سہی ملک جی۔ ادھر گلی کی طرف کو سنے ہیں دکان بنے گی۔ وہ بھی پکی ہو گی"

"دکان بھی پکی ہو گی؟"

"جی ہاں سب پکا ہو گا۔ پھر میں لائل پور، لاہور جاکر نئے نئے اوزار لاؤں گا۔ ہاتھی دانت کے دستوں والے اوزار۔ اور جس دن یہ سب کچھ ہو جائے گا اس دن آپ کو بلاؤں گا کہ میرے گھر میں آکر میرے سر پہ ہاتھ پھیر دیجیئے۔"

"خدا تجھے برکت دے بشکو" ملک کرم الٰہی جیسے ٹوٹتے ہوئے نقشے

کے عالم میں بولے "مگر اس تیرے شیشی محل سے کچا مکان کیا بُرا تھا؟ اور یہ بھی تو کچا ہوتا ہے پر میں نے دیکھا ہے کہ پکے سے زیادہ ٹکتا ہے۔"

"نہیں ملک جی" اللہ بخش نے کہنا چاہا مگر زبان کو بند دانتوں کے پیچھے دبا کر رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ "ملک جی۔ لٹھا کھدر سے زیادہ ٹکتا ہے۔ ریشم لٹھے سے زیادہ ٹکتا ہے۔ زیادہ روپیہ کم روپے سے زیادہ ٹکتا ہے اسی طرح پکا مکان کچے سے کہیں زیادہ ٹکتا ہے۔ اپنے ابا کا مکان دیکھ لیجیے اور میرے ابا کا مکان دیکھ لیجیے۔" وہ صرف اتنا کہہ پایا کہ "بس جی چاہتا ہے بچے کیا یاد کریں گے۔"

"تیری مرضی" ملک صاحب نے کہا۔ جیسے وہ اللہ بخش کو خودکشی سے روکنے میں ناکام رہے ہوں۔

اللہ بخش کا مکان بننا شروع ہوا تو گاؤں کے اس حصے میں ایسی چہل پہل نظر آنے لگی کہ بڑے بڑوں کی حویلیوں کی تعمیر میں بھی نظر نہیں آئی ہوگی۔ لکڑی کی گیلیوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں جن سے دروازے اور کھڑکیاں اور پیٹیاں اور الماریاں تک بنائی جا رہی ہیں۔ لوہے کے اکٹھے چار گاڈر آ رہے ہیں سیمنٹ کے گٹے اتارے جا رہے ہیں۔ چھت کے لیے رنگین ٹائلیں اور گول اور چوکور آئینے بلائے جا رہے ہیں۔ دروازوں، کھڑکیوں اور الماریوں کے لیے تانبے اور چینی کی دستیاں خریدی جا رہی ہیں۔ تین کوٹھوں کے سامنے ایک

لمبا برآمدہ بن رہا ہے۔ تیسرے کوٹھے میں آتش دان تیار ہو رہا ہے جس کی چمنی اتنی اونچی ہے جیسے چھت پر اللہ بخش کھڑا ہے۔ پھر ادھر دکان کے فرش کو سیمنٹ سے پختہ کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی الماریوں میں رنگین شیشے لگ رہے ہیں۔ سلیٹی سیمنٹ کی درزوں میں نیلے رنگ کے حاشیے کھینچے جا رہے ہیں ایک طرف "کھرا" بن رہا ہے کہ کبھی کبھی گھر میں بھی نہا لینے کو جی چاہتا ہے۔ حد یہ ہے کہ پردہ دار گھروں کی سی پختہ چار دیواری بن رہی ہے۔ اور ایک جگہ نقش و نگار اور شیشمی رنگ کے روغن والا اتنا بڑا دروازہ لگایا جا رہا ہے۔ کہ اونٹ بھی چاہے تو ذرا سا جھک کر گزر جائے۔

اللہ بخش کا مکان صرف اس گاؤں ہی کا نہیں سارے علاقے کا موضوعِ گفتگو بن گیا تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ دھرتی کے "درمنہ" پہ یہ پہلا پکا مکان تھا۔ جسے ایک موچی بنوا رہا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ اللہ بخش اب تک گیارہ بارہ ہزار روپے خرچ کر چکا تھا۔ ملک کرم الٰہی جانتا تھا کہ جس روز اللہ بخش نے ان سے پانچ سو کی امانت واپس لی تھی، اس روز سے اس نے ایک جوتا بھی نہیں بنایا تھا۔ وہ دن بھر تعمیر کی نگرانی کرتا۔ مستریوں اور مزدوروں کی "پچھائیں" کے لئے گھر سے تازہ تازہ مزے دار بنا لاتا۔ سامان کی حفاظت کے لئے رات وہیں صحن میں گزارتا اور صبح کو نماز سے فارغ ہوتے ہی مستریوں مزدوروں کو جمع کرنے میں لگ جاتا۔

ملک کرم الٰہی نے ایک دو مستریوں سے بھی پوچھا۔ معلوم ہوا کہ انہیں اپنے کام کی اُجرت باقاعدہ ہر شام کو مِل جاتی ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اللہ بخش کو یکایک اتنی بہت سی دولت کیسے ہاتھ لگ گئی ہے۔ ان کا یہ بھی جی چاہا کہ اللہ بخش سے پوچھ لیں اگرچہ اللہ بخش کا یہ فقرہ ان کے ذہن میں کھونٹے کی طرح گڑا ہوا تھا کہ "صرف بڑے لوگ ہی تو پکے مکان اپنے نام لکھوا کر نہیں لائے ملک جی" کئی دفعہ چوپال پر بھی اللہ بخش کے مکان کی بات چلی مگر بڑھ نہ سکی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے لوگوں کو اس مسئلے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اور اگر ایک موچی پکا مکان بنوا رہا ہے تو بنوا تا پھرے۔ آخر کوئی کیا کر سکتا ہے۔

جس روز مکان کی آخری درز پر بھی سیمنٹ لگ گئی اور اس میں نیلا عافیہ کھد گیا تو مستریوں، مزدوروں اور تماشائیوں نے اللہ بخش کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور اس پر "مبارک ہو" کا مینہ برسا دیا۔ اللہ بخش اس وقت کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اچانک وہ وہیں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور کچھ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ اس دوران میں بھاگی گڑ اور بتاشے بانٹتی پھری اور اللہ بخش اور بھاگی کے بچے بڑے دروازے پر یوں بے تاب کھڑے نظر آئے جیسے بس نہیں چل رہا ورنہ مکان کو سر پہ اٹھا کر گلی گلی لیے پھرتے۔ اسی دوران

میں ملک کرم الٰہی آنکلے اور اس کے پاس آکر بولے "مبارک ہو" لیکن اللہ بخش نے ہاتھ چہرے پر سے ہٹائے تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ رو رہا ہے۔

"رو کیوں رہے ہو؟" ملک کرم الٰہی نے پوچھا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے مسکرائے اور بولے، "اتنا خوش ہوا ہے کہ رو رہا ہے۔" پھر وہ چلے گئے۔ آہستہ آہستہ سب لوگ چلے گئے۔ پھر اللہ بخش بھی بیوی بچوں سمیت چلا گیا۔ اور شام سے کچھ دیر پہلے سب سروں پہ سامان لادے اپنے پکے مکان میں واپس آگئے۔

بچے صحن میں اینٹوں کے فرش پر ناچنے کودنے لگے، ہنسنے اور رونے لگے اور اللہ بخش بیوی اور بڑے بچوں کو مکان کی حفاظت کرنے اور اس کی خوبصورتی کو قائم رکھنے کے گر سمجھاتا رہا۔ اس نے انہیں بتایا کہ اتنے اچھے مکان میں ٹوٹے ہوئے صندوق، جھولتے ہوئے کھٹولے اور چیتھڑے سے نکلے لحاف بھلے نہیں لگتے۔ اس لئے یہ سب کچھ بدلا جائے گا۔ ساتھ ہی مٹی اور تام چینی کے برتنوں نے آتش دان والے کمرے کے فرش کا ناس مار دیا تھا مگر "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے دو گبرو بچے، میرے یہ بازو سلامت رہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

"ہائے میں تو سوچتی ہوں مجھے نیند کیسے آئے گی اس شیش محل میں؟" بھابی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں گاڑ کر اور انگوٹھوں

سے اپنی ٹھوڑی کو پکڑتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہنسنے لگی۔ مگر ایک دم چپ ہو گئی
اللہ بخش رو رہا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ یکایک چار دیواری کا بڑا دروازہ کھلا اور گامی مٹی کے بلتے ہوئے ایک چراغ کی لو کو اپنے ایک ہاتھ کے حصار میں لیئے داخل ہوئی۔ بچوں نے "پھوپھی پھوپھی" کا شور مچا دیا۔ بھائی نے آگے بڑھ کر گامی سے چراغ لینا چاہا مگر وہ بولی۔ "میں تو اپنے دیرے کے شیش محل میں اپنے ہاتھ سے چراغ سجاؤں گی!" وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کہکر اندر گئی۔ ایک کھلی کھڑکی میں چراغ رکھ دیا اور پھر چاروں دیواروں کو چوم کر باہر آئی تو بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہائے آج میری ماں ہوتی۔ ہائے آج میرا باپ ہوتا۔ دنیا آج جل رہی ہے پر وہ کتنے خوش ہوتے۔ ہائے وہ کتنے خوش ہوتے!" وہ زار زار رونے لگی۔ پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میرا دیرہ کہاں ہے؟"

اللہ بخش دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ چراغ کی روشنی میں آ گیا تو گامی اس سے لپٹ گئی اور بولی۔ "میرے دیرے میں تو اپنے چراغ کے سو روپے لوں گی اور ابھی اسی ہاتھ پہ لوں گی، میں نے جب اپنے گھر والے سے کہا کہ میں اپنے دیرے کے شیش محل میں چراغ جلانے کے سو روپے لینے جا رہی ہوں تو وہ کتیا کا جنا ہنسنے لگا۔ کہنے لگا سو آنے ہی لے آئے تو مانوں۔ ان کے بھی بھلا چھ روپے بنتے ہیں۔ وہ سب کو اپنے جیسا ہی سمجھتا ہے کنجوس مکھی چوس

لا میرے ویرا اپنی بہن کا حصہ۔"

"میں اپنی بہن کو سو روپے دوں گا۔" اللہ بخش۔ "کیوں نہیں دوں گا۔"

"تو پھر لا جلدی سے" گامی اب خوشی سے رو رہی تھی "میں تو یہ سو روپے گاؤں کی گلی گلی میں نچاتی ہوئی جاؤں گی اور کہوں گی۔ ایسے ہوتے ہیں بہنوں کے ویر۔ جو شیش محل بنوا سکتے ہیں وہ سو روپیہ بھی دے سکتے ہیں۔ لا میرے ویر۔"

اللہ بخش چپ چاپ کھڑا اپنی بہن کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا "ذرا بیٹھ جا گامی۔ میں ابھی لاتا ہوں۔ میں نے روپے ایک اور جگہ رکھے ہوئے ہیں۔"

"میں تو یہاں تیرے انتظار میں قیامت تک بیٹھی رہوں گی۔" گامی نے بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے خالی ہاتھ گھر جا کر کیا جوتے کھانے ہیں۔ تو لے آ۔ جب تک بھرجائی سے باتیں کروں گی۔"

اللہ بخش جانے لگا۔ پھر پلٹ کر آیا اور بولا "گامی۔ تو برا نہ مانے تو چراغ کھڑکی سے ہٹا لوں۔ اس کی لو کھڑکی کی ڈاٹ کو کالا کر دے گی۔"

"ہائے میں غریب کیا جانوں۔" گامی ہڑبڑا کر اٹھی اور اندر چلی گئی پھر چراغ اٹھاتے ہوئے جھک کر ڈاٹ کو دیکھا اور بولی "ہائے سچ مچ کچھ نشان پڑ بھی گیا ہے۔ ہائے میری آنکھیں پھوٹیں مجھے کیا پتہ کہ پکے مکانوں میں چراغ کہاں جلتا ہے۔" اس نے چراغ کو مکان کے وسط میں فرش پر رکھ دیا۔

وہ یہاں تو ٹھیک ہے نا" اس نے اللہ بخش سے پوچھا۔ "وہ میں اسے بجھاؤں گی نہیں۔ تیل ختم ہوگا تو خود بخود بجھ جائے گا اور تیل پوری رات ختم نہیں ہوگا۔ میں تو پانچ پیسے کے تیل سے بھروا کے لائی ہوں۔ جا میرے ویر جلدی سے میرے روپے لے آ۔"

اللہ بخش چلا گیا۔

گامی نے آدھی رات تک اس کا انتظار کیا اور پھر روتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

اللہ بخش کی بیوی نے صبح تک اپنے شوہر کا انتظار کیا اور پھر پیٹنے بیٹھ گئی۔

اللہ بخش آج چھ سال سے گاؤں میں نہیں آیا۔

اس کے شیش محل میں تالا لٹک رہا ہے۔ چھتوں پہ ہاتھ ہاتھ بھر گھاس اگ آئی ہے۔ صحن میں اینٹوں کے فرش میں سے بھی پودے نکل آئے ہیں۔ اور دروازوں کا نیلا حاشیہ روئی ہوئی آنکھوں کے کاجل کی طرح بہہ کر پھیل گیا ہے۔

اللہ بخش ان دنوں لاہور میں ہے۔ وہ کچہری روڈ پہ بھلے اور لطو سمیت یونیورسٹی کے طلبا کے جوتے گانٹھتا اور پالش کرتا ہے۔ اور اس کی بیوی مصری شاہ میں ایک پکے مکان سے ملحق نوکروں کی کچی کوٹھری میں بیٹھی بچے پالتی رہتی

ہے۔ اللہ بخش اور اس کے بیٹے دن میں چھ سات روپے کما لیتے ہیں مگر وہ
ہر روز پانچ روپے الگ رکھ دیتا ہے۔ اور ہر مہینے ڈیڑھ سو کا منی آرڈر
اپنے گاؤں کے کسی نہ کسی کھاتے پیتے آدمی کے نام بھجوا دیتا ہے۔ جب
منی آرڈر بھجوا کر آتا ہے۔ تو بھاگی کو ایک ہی بات سمجھاتا ہے " رحمت
بھاگی۔ یہ روپیہ ان لوگوں کو جا رہا ہے جن سے میں اپنے پکے مکان کے
لئے قرض لیتا تھا اور انہیں رسولِ پاکؐ کی قسم دیتا تھا کہ میری ناک کا معاملہ
ہے اکسی کو بتائیں نہیں۔ وہ رسولِ پاکؐ کی قسم پہ قائم رہے تو میں سوچی بھی
پہ اتنا کمینہ نہیں ہوں، کہ مروں تو رسولِ پاکؐ کے دربار میں آنکھیں بھی نہ اٹھا
سکوں۔ اگر اس دن ملک کرم الہٰی مجھے گامی کے لئے سو روپے دے دیتا تو
میں دس ہزار کا قرض یوں چٹکیوں میں اتار دیتا۔ میں سیدھا اس کے پاس
چلا گیا کہ اس سے میں نے مکان کے لئے قرض نہیں مانگا تھا۔ اس نے قرض
بھی نہ دیا اور بھری چوپال میں آگے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اب راز کھلا ہے نشکو کے
پکے مکان کا۔ یہ کمبخت تو ادھر ادھر سے قرض لیتا رہا ہے۔ تم میں سے
اسے کس کس نے قرض دیا ہے بھئی لوگو!" اور بھاگی! آفرین ہے لوگوں پہ
کہ ان میں سے ایک بھی نہ بولا۔ میرے پسینے نکل گئے پر کوئی ایک
بھی نہ بولا۔ سب اپنے رسولِ پاکؐ کی قسم پہ قائم رہے۔ ملک ان سے
بار بار پوچھتا رہا اور میں اس کی چوپال سے چلا آیا۔ میں گاؤں ہی سے

چلا آیا۔ میں لاہور چلا آیا۔ پھر تم لوگوں کو بھی بلوا بھیجا۔ اب بس کُل سات سو باقی ہیں۔ دو سو میری گامی بہن کے اور پانچ سو ملک گل باز کے۔ ملک گل باز کو میں نے چٹھی لکھی تھی۔ اس نے جواب دیا تھا کہ بے شک مجھے سب سے آخر میں دینا اور لکھا تھا کہ آکر اپنا مکان تو دیکھ جاؤ۔ پانچ چھ سال سے بند پڑا ہے۔ میں نے چٹھی لکھی کہ اب اکٹھے ہی آئیں گے۔ قرض پورا ہو جائے تو سیدھے گاؤں کی راہ لیں گے اور اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر پکار پکار کر ملک کرم الٰہی سے کہیں گے کہ "ملک جی یوں بنتے ہیں پکے مکان اور یوں رہتے ہیں پکے مکانوں میں۔"

بھاگی نے کہا "ملک تو ضرور کہے گا کہ شرم کرو لشکو، شرم کرو۔"

"تو میں کہوں گا۔" اللہ بخش بولا "میں کہوں گا۔ ملک جی۔ اب شرم کاہے کی کروں۔ اب تو میرا شیش محل میرا اپنا شیش محل ہے۔"

(دسمبر ۱۹۵۹ء)

مجرم

ڈوبتا ہوا سورج ایک بدلی سے چھو گیا تو شام کو آگ لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفق بدلی میں سما نہیں سکی اس لئے چھلک پڑی ہے۔ شہر کی عمارتوں، درختوں، سڑکوں، بسوں اور موٹروں، شہریوں کے لباسوں اور ان کے چہروں پر اس ایک لمحے کے موقلم نے شفق کے شعلے کا رنگ چھیر دیا تھا۔ ہماری کار جب حمید کے بنگلے میں داخل ہوئی تو عرفان بولا "دیکھو، دیکھو لوگو۔ رنگ تو دیکھو حمید کے بنگلے کا۔" اس نے کار بہت آہستہ کر لی۔ اور اپنے خاص انداز میں ٹھہر ٹھہر کر اور مزے لے لے کر بولنے لگا۔

وہ ہوش میں یوں بولتا تھا۔ جیسے لوگ شراب پی کر بولتے ہیں۔ اور شراب پی کر تو وہ بہت کم بولتا تھا۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی شرارت ہے تو میں یہ سمجھ کر کار کو بیک کر لے جاتا

کہ ہم کسی غلط بنگلے میں آ گئے ہیں۔ حمید کے بنگلے کا رنگ تو نرس کے لباس کی طرح سفید ہے اور ہم جس بنگلے میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ تو شرمائی ہوئی لڑکی کے گالوں کی طرح گلابی ہو رہا ہے۔ دیکھو دیکھو، وہ انڈے سے اترتی ہوئی مسز حمید کو دیکھو۔ کیسی لگ رہی ہیں!"

"شگفتے دی لاٹ ورگی" شہید بے ساختہ بولا۔

عرفان اور میں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ شہید مسکراتا رہا۔ اور بے آواز چپ چاپ بیٹھا ونڈ سکرین سے باہر یوں دیکھتا رہا جیسے وہ طیارے میں سوار ہے۔ اور طیارہ بادلوں میں سے گذر رہا ہے۔ عرفان نے کار روک لی اور مسز حمید بولیں "کوئی لطیفہ ہو گیا کیا؟"

شہید بے تکلف یعنی منہ پھٹ آدمی ہے۔ اس لئے میں اس ڈر سے کہ کہیں وہ پنجابی بولی کو دہرا نہ دے، فوراً بولنے لگا۔ "شہید کہہ رہا ہے کہ جنت کی دیواروں پر دوزخ کے شعلوں کی چمک اسی طرح ناچتی ہو گی جیسے اس وقت شفق نے آپ کے بنگلے۔۔۔۔۔"

مگر میرے فقرہ پورا کرنے سے پہلے ہی مسز حمید نے تالی بجا دی۔ وہ زور کا قہقہہ لگانے سے پہلے ہمیشہ تالی بجاتی ہیں۔ اس لئے انہوں نے تالی بجائی اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں میں دبا کر ہنسنے لگیں اور ان کے لمبے بال جنہیں ایک ربن نے ان کی پیٹھ پر

سمیٹ رکھا تھا۔ ان کے شانوں پر بکھر بکھر گئے۔

اتنے میں حمید بھی بھاگتا ہوا آ پہنچا۔ وہ گیلا گیلا سا لگ رہا تھا۔ شاید نہا کر نکلا تھا۔ اس نے آتے ہی ہم سے مصافحہ کرنے کے بجائے رب نواز کے پاس جا کر اس کی لمبی ناک مروڑ دی۔

رب نواز ہمارا فلسفی دوست ہے۔ وہ گھنٹوں کچھ نہیں بولتا اور جب وہ نہیں بولتا تو کم سے کم میں نے ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ اگر اس کا منہ کھولا جائے تو اس کی زبان پھپھوندی سے سفید ہو رہی ہوگی۔

البتہ جی بھر کے شراب پی لینے کے بعد جب وہ بولنے پر آتا ہے تو چاہے آپ اکتا کر با آواز بلند اور با جماعت جماہیوں پر جماہیاں لیں، وہ بولتا چلا جاتا ہے (یعنی وہ اس معاملے میں عرفان کے بالکل الٹ ہے) ویسے گفتگو میں خواتین بھی شامل ہوں تو وہ انھیں قدم قدم پر بولنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔ اور انھیں ممنون کر کے بہت خوش ہوتا ہے۔ اس وقت وہ عرفان کی کار میں پچھلی سیٹ پر میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ مگر جب سے بیٹھا تھا۔ بس بیٹھا تھا۔ دوستوں کا دوست تھا۔ اس لئے سب اسے برداشت کرتے آ رہے تھے۔ مگر آج اتنی چمکتی ہوئی رنگین شام میں اس کی خاموشی مجھے تو زہر لگ رہی تھی۔ میں نے رستے میں ایک بار اس سے کہا بھی کہ "آنو صاحب آپ بھی تو کچھ بولیے۔" مگر وہ آنو وں کی طرح

میری طرف دیکھنے لگا تھا۔ اور شہید نے یہ کہہ کر اُسے خارج از بحث کر دیا تھا کہ "اُلو تو صرف رات کو بولتے ہیں۔"

حمید نے رب نواز کی ناک مروڑی تو وہ چلّایا۔ "میں کیاں ننکو انسس ہیں؟"

اور شہید کو ملبس کی طرح اُچھل کر بولا۔ "یار و مجھے نواز کی آواز سنائی دے رہی ہے!"

ہم ہنس رہے تھے تو ایک دم جیسے کسی مشین کا بٹن دب گیا اور ہمارے سروں پر پھیلے ہوئے پیپل کی شاخوں میں سنیکڑوں چڑیاں دن کا ماتم کرنے لگیں۔ کسی نے جیسے پھونک مار کر سورج کو بجھا دیا۔ بدلی جو شفق سے جل اٹھی تھی۔ راکھ ہو گئی۔ بنگلے کا رنگ سرمئی سا ہو گیا۔

اور دور کسی مسجد میں لاوڈ سپیکر پر کوئی اذان دینے لگا۔

برآمدے میں آ کر حمید بولا۔ "سوؤر د۔ تم سے کس نے کہا تھا۔ کہ شام سے پہلے ہی میرے گھر میں آ دھمکو۔ بیگم سے پوچھ لو کہ خاص مہمان کے آنے میں ابھی کم سے کم ایک گھنٹہ باقی ہے۔ اور تم جانتے ہو خالد وقت کا کتنا پابند ہے۔ اب تم آ گئے ہو تو ظاہر ہے کہ بیٹھ کر چھت کی کڑیاں نہیں گنو گے بلکہ میری وہسکی پر جھپٹو گے جو میں نے نہ جانے کس کس کے پرمٹ مانگ تانگ اور چھین جھپٹ کر جمع کی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ آج

رب نواز (جو) پینے کے موڈ میں ہوا تو ـــــ "کیوں نواز۔ تم تو نہیں پیو گے؟"
"نہیں پیوں گا" رب نواز بلی کی میاؤں کے سے لہجے میں بولا۔

اور حمید کو عرفان اور شہید اور میں نے بڑی مشکلوں سے تھاما جو صدمے سے بے ہوش ہونے کے لئے ایک آرام کرسی پر گرنے جا رہا تھا۔

بیگم حمید میرے پاس آکر بولیں "کیوں رحیم صاحب کہیں آپ بھی تو نہیں پینے لگے؟"

میں نے کہا "برسوں تک بندہ ان شیطانوں کی صحبت بد کے اثرات سے محفوظ رہا ہے لیکن دیر تک گندی صحبت میں رہنے سے انسان، انسان سے زیادہ خربوزہ بن جاتا ہے۔ اور بزرگ کہہ گئے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔"

"ہائے اللہ۔ تو آپ بھی پینے لگے!" بیگم حمید نے دونوں ہاتھ اپنے دونوں کولھوں پر دے مارے۔ "ہائے میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ آپ آئیں گے تو آپ سے غالب کے چند اشعار سمجھوں گی۔ بڑی الجھن میں ہوں۔"

"کیوں حضرت رحیم؟" شہید نے مجھ سے پوچھا "اس دوران میں رام پور کے عرشی صاحب نے غالب کی کوئی غیر مطبوعہ غزل تو نہیں چھپوا دی ہے؟"

میں نے کہا "بکواس مت کرو۔ تم کیا جانو شاعری کس چڑیا کا نام ہے۔"

"اچھا تو یہ کسی چڑیا کا نام ہے؟" شہید بولا اور سب لوگ رسوائے رب نواز کے، قہقہے مارتے، تالیاں بجاتے اور پاؤں پٹختے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ آخر میں رب نواز یوں داخل ہوا جیسے بکرا مذبح میں داخل ہوتا ہے۔ شراب پینے سے پہلے رب نواز پر ہمیشہ اسی طرح عاجزی اور خاکساری کا دورہ پڑتا ہے۔

صوفوں پر بیٹھ کر ہم ابھی بیگم حمید کے ذوقِ آرائش کی پوری داد بھی نہیں دے پائے تھے کہ ایک کار کے رکنے کی آواز آئی اور حمید یہ فریاد کرتا ہوا باہر لپکا کہ سب کمبختوں نے وقت سے پہلے آ کر اس کی وہسکی کے سٹاک کا صفایا کرنے اور خالدار زکریا کے سامنے اسے شرمندہ کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ بیگم حمید بھی باہر چلی گئیں۔ پھر ایک اور کار رکی۔ اس کے بعد ایک اور کار رکی۔ برآمدے میں باتوں سے زیادہ قہقہوں کی آواز آنے لگی۔ پھر باہر کسی خاتون کی بڑی لمبی ہنسی کی آواز آئی اور اندر شہید اپنے آس پاس اور صوفوں کے نیچے یوں دیکھنے لگا جیسے کچھ ڈھونڈھ رہا ہے۔

"کیا ڈھونڈھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"گھنگھرو کہاں گیا؟" وہ بولا۔

"گھنگھرو؟" میں نے پوچھا۔

"گھنگھرو کیسا مسخرے کہیں کے؟" عرفان نے آس پاس جھانکتے

ہوئے کہا۔

شہید بولا "وہی جو ابھی ابھی باہر ورانڈے سے رڑھک کر اندر آیا ہے۔"

ہنستی ہوئی خاتون ہنستی ہوئی اندر آئیں تو حیلولا "یہ جو ابھی تک بج رہا ہے۔"

"کیا بج رہا ہے ـــــ؟" خاتون نے ہنسی روک کر پوچھا۔

"گھنگھرو۔" شہید بولا۔ اور ہماری جان نکل گئی۔

شوہر کی خودکشی کے بعد بیگم نورالہدیٰ کو نہ جانے کیا ہوا تھا کہ دوسروں کی تو خوب خوب ہنسی اڑاتی تھیں مگر اپنے بارے میں ذرا سی بات سے بھی بھڑک اٹھتی تھیں۔ اور ایک دو پارٹیوں سے تو وہ اسی بنا پر واک آؤٹ بھی کر چکی تھیں۔ شہید کا جواب سن کر ہمیں یقین ہو گیا کہ خالد کی شادی کی خوشی میں دی جانے والی اس پارٹی کا آغاز ہی تلخی سے ہوگا۔

"گھنگھرو؟" بیگم نورالہدیٰ نے پوچھا "کہاں بج رہا ہے گھنگھرو؟"

"رب نواز کے گلے میں بج رہا ہے۔" شہید بولا۔ اور عرفان اور میں نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ بیگم نورالہدیٰ گھنگھرو بجانے لگیں اور شہید بولتا رہا۔ "کھانے سے پہلے وہسکی ملنا یقینی ہوا۔ وہسکی کے آنے میں ذرا سی دیر ہو جائے تو رب نواز کے گلے میں موت کا گھنگھرو بجنے لگتا ہے۔

آپ سب ذرا سانس روک کر سنئیے تو یہ مسلسل بج رہا ہے۔"
سب مسکراتے ہوئے خاموش ہو گئے تو رب نواز بولا "یہ کیا بڑا بات ہے"
"لیجئے" شہید بولا "ہم گھنگھرو کو رو رہے تھے اور یہاں گھڑیال بجنے لگا۔"

ایک زرین قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ پھر سب لوگ صوفوں میں دھنس گئے بیگم حمید اور بیگم نورالہدیٰ کے علاوہ دو خواتین اور بھی تھیں ایک شیخ شفقت الٰہی مرحوم کی بیوہ اور دوسری ان کی لڑکی نشمین۔ میں نے نشمین کو لڑکی اس لئے کہا ہے کہ وہ ابھی تک کنواری تھی۔ اور خواتین میں اس لئے شامل کیا ہے کہ اس عمر کی کنواریوں کو خواتین نہ کہا جائے تو کئی غلط فہمیوں کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اس لئے باہمی تعارف کی ضرورت نہ تھی۔ کچھ دیر تک بیگم حمید کے ذوق آرائش کی تعریف ہوتی رہی اور وہ تالی بجا بجا کر ہنستی رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے ڈرائنگ روموں میں رکھے ہوئے نوادرات کے شجرے سنانے لگے۔

مسٹر رشید مسیح نے بتایا کہ اس کے پاس والٹ وٹمین کے آٹوگراف ہیں۔ اس پر بیگم شفقت الٰہی بولیں۔ "دیکھئے حمید صاحب۔ آپ سے میں نے کتنی بار کہا ہے۔ کہ آپ اتنی اچھی اچھی گلٹرنگ قسم کی پارٹیاں دیتے

رہتے ہیں مگر آپ سے یہ کبھی نہ ہوا کہ وہسکی کے ساتھ کسی ایک آدھ شاعر کا بھی انتظام کر دیتے۔ بیگم حمید تو ریڈیو پر عورتوں کے پروگرام میں غالب کی غزلیں پڑھتی رہی ہیں۔ وہی حمید صاحب کو یاد دلا دیا کریں۔ اور آج تو آپ نے اپنے دوست کی شادی کی تقریب میں دعوت دی ہے۔ آج کوئی شاعر واعر ہوتا تو کوئی سہرہ وہرہ ہو جاتا۔“

”کیا کروں بیگم صاحبہ،“ حمید بولا ”کوئی شاعر میرا واقف ہی نہیں مجھے تو داد دینا بھی نہیں آتا۔“

”لیجئے۔ آپ تو کمال کرتے ہیں حمید بھائی،“ نشیمن بولی ”شاعر سے واقفیت میں کیا لگتا ہے۔ رقعہ بھیج دیجئے کہ پارٹی ہے۔ شرب و نوش کا انتظام ہے تشریف لائیے گا۔ میں کہتی ہوں آپ کسی بھی شاعر کو ایسا رقعہ بھیج دیتے تو شہید صاحب اور نواز صاحب سے بھی پہلے آپ کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا آداب عرض کرتا ملتا۔“

سب کھٹاک سے ہنسے۔ پھر بیگم نورالہدیٰ ساڑھی کے پلو کو سینے پر کس کر پھیلاتی ہوئی بولیں ”مضراب صاحب کیسے رہتے؟“

”سویٹ“ خواتین و حضرات یک زبان ہو کر بولے۔

”ہائے سچ کہتی ہوں،“ نشیمن نے کہا ”مجھے تو کسی اردو میگزین میں مضراب کا کلام نظر آ جائے تو کیٹس اور ڈائلن ٹامس یاد آ جاتے ہیں۔

دیکھئے انکل عارف۔ اگر ان کے گھر میں فون ہو تو یہیں سے فون کر دیجیے۔"
"ہمارے ہاں کے شاعروں کے گھروں میں فون نہیں ہوتے۔" ایس محمد عارف بولے۔

"اور جب وہ فون لگوانے کے قابل ہو جاتے ہیں تو شاعر نہیں رہتے۔" شہید نے وضاحت کی۔

"یہ سب کیا بکواس ہے؟" رب نواز نے احتجاج کیا۔ "شاعروں کو مارو گولی۔ بھئی حمید، کچھ منگانا ہے تو منگاؤ ورنہ اجازت دو۔"

"اجازت؟ اجازت کیسی؟" بیگم حمید چونک کر کھڑی ہو گئیں۔

سب نے ایک ساتھ پلٹ کر رب نواز کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اٹھ کر جانے لگا ہے۔

"اجازت کا کیا مطلب نواز؟" حمید نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا اور رب نواز وہی مسمسی صورت بنائے، اسی منمناتی آواز میں بولا "یہی کہ اگر تم وہسکی نہیں لاتے تو میں خود جا کر فریج سے نکال لاؤں۔"

قہقہوں سے ساری محفل لوٹ پوٹ ہو گئی اور حمید پسلیوں کو دونوں ہاتھوں سے دبائے اندر بھاگ گیا۔

چند ہی لمحوں میں تپائیوں پر وہسکی اور شیری کی بوتلیں سجا دی گئیں۔ بیرے گلاس اور سوڈے کی بوتلیں لئے حاضر ہو گئے کاگ بلبلا کر اڑے اور

آن کی آن میں وسیع ڈائننگ روم شراب کی بُو سے بھر گیا۔ سب تین تین چار چار کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کاروں کے نئے ماڈلوں حصص کی قیمتوں، لندن اور نیویارک کے ڈراموں اور بعض لوگوں کی شادیوں بعض کی متوقع طلاقوں اور بعض غیر مصدقہ اسکینڈلوں پر یوں گفتگو ہونے لگی جیسے بعد میں سب کو مِل کر اپنی بحث کے نتائج پر غور کرنا اور ایک رپورٹ مرتب کرنا ہے۔ صرف رب نواز چُپ چاپ بیٹھا پیتا رہا اور نشیمن کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا جو دوسری خواتین کے برعکس شیری کے بجائے وسکی پی رہی تھی۔ اس کی ساری کا پلّو شانے سے ڈھلک کر اس کی گود میں ڈھیر ہو گیا تھا۔ اور بہت اونچی اور بہت کسی ہوئی بلاؤز کے کنارے اس کے پیٹ، پیٹھ اور بازوؤں کے گوشت میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔

یہ اس کا پانچواں پیگ تھا اس لئے وہ کہہ رہی تھی: "ممی۔ اے ممی جی اب اس عمر میں تو شیری پر لعنت بھیجئے اور وہسکی بھی چکھئے۔ قسم سے آپ دو تین پیگوں کے بعد ایک دم میری ہم سن ہو جائیں گی۔"

"ماشاء اللہ کیا سِن ہوگا آپ کا؟" بیگم نور الہدیٰ نے ایک باچھ سے مسکرا کر پوچھا۔

مگر نشیمن سے پہلے بیگم شفقت الٰہی بول پڑیں۔ "پچھلے سال اکتوبر میں اس کی بیسویں سالگرہ منائی تھی۔ اکیسویں میں پاؤں رہتے پچیسویں

میں شادی بیاہ کا سوچیں گے۔"

"شادی کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں کی جا سکتی۔" رب نواز نے چھٹا پیگ ایک ہی ڈیک میں پینے کے بعد کہا۔ "شادی کے لئے صرف بلوغت شرط ہے۔ اور اس کے بعد ہونے والے میاں بیوی کی افہام تفہیم یعنی میوچل انڈرسٹینڈنگ، یہ افہام تفہیم سولہ سترہ برس کی عمر میں بھی ہو جائے تو اس کے بعد شادی نہ کرنا غلط ہو گا اور اگر تیس برس کی عمر میں بھی نہ ہو پائے تو شادی کرنا غلط ہو گا۔ کیا خیال ہے آپ خواتین و حضرات کا؟"

"نشہ ہو رہا ہے چغد کو۔" شہید بولا۔ "مچھلی کی طرح پیتا ہے مکبخت۔" پھر وہ رب نواز سے براہ راست مخاطب ہوا۔ "تیرے فلسفے کی ایسی کی تیسی۔ ہم پیئیں کہ تیری بک بک سنیں۔"

"پینا بجائے خود بے معنی ہے۔" رب نواز نے پروفیسروں کی سی سنجیدگی سے کہا۔ "پینا تو ایک مقصد کا ذریعہ ہے اور مقصد یہ ہے کہ انسان زندگی کا جتنا رس نچوڑ سکتا ہے، نچوڑ لے۔ کیونکہ زندگی مختصر ہے انسان فانی ہے۔ جوانی ایک اڑتے ہوئے بادل کا سایہ ہے۔ اور خوشی کے لمحے ابابیلیں ہیں۔"

"ہائے نواز صاحب، کیا بات کہہ گئے آپ۔" نسیم جوش میں اٹھ کھڑی ہوئی اور زور زور سے سانس لیتی ہوئی بولی۔ "آپ اتنی دور کیوں

بیٹھے ہیں نواز جی۔"

"یہاں آجائیے۔" بیگم حمید نے نشمین کے پہلو سے اٹھ کر کہا۔

"نواز صاحب نے تو شاعروں کی کمی پوری کر دی۔" بیگم شفقت الہٰی نے داد دی۔

"آداب عرض کرتا ہوں۔" رب نواز ہاتھ میں گلاس لیے اٹھا۔ وہ بے ڈھنگے قدم اٹھاتا اور ہونٹوں پہ ایک بے ڈھنگی مسکراہٹ لیے نشمین کے پاس آ بیٹھا اور پھر باہر ایک موٹر کے رکنے کی آواز آئی۔

"خالد ہوگا۔" حمید بولا اور باہر لپکا۔ بیگم حمید بھی جلدی سے باہر چلی گئیں۔

"کیسی نبھ رہی ہے دونوں کی؟" بیگم نورالھدیٰ نے جیسے سب سے پوچھا۔ "جانے کیسی کیسی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ پر مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"کیوں؟ کیوں یقین نہیں آتا؟" رب نواز بولا۔ "جن لوگوں نے محبت بھی کی ہے۔۔۔ اور سوسائٹی کی عزت بھی کی ہے، انھیں تو فوراً یقین آجاتا ہے۔ مثلاً مجھے یقین ہے کہ خالد کے متعلق جو باتیں اس کی شادی سے پہلے سننے میں آتی رہیں اور اس کی شادی کے بعد سننے میں آرہی ہیں وہ سب سچ ہیں۔ اور اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو دو باتوں میں ایک بات ضرور ہے یا آپ نے سوسائٹی کی عزت نہیں کی یا آپ نے محبت نہیں کی۔"

بیگم نورالھدیٰ کا رنگ فق ہوگیا۔ اور وہ رونے کے قریب پہنچ

گیش مگر پھر شہید تڑپ کر بولا۔ "خبردار رہیئے گا خواتین و حضرات۔ یہ چندبیر پھیر سے ہمیں یقین دلانا چاہتا ہے کہ اُس نے بھی محبت کی ہے حالانکہ میرا دعوٰی ہے کہ کسی عورت نے اس کے مُنہ پر جوتا بھی نہیں مارا۔

"تمہارے منہ پر کتنی عورتوں نے کتنے جوتے مارے ہیں؟" رب نواز چہکا اور نشین کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنسنے لگا۔ بیگم نورالہدٰی بھی گھنگھرو بجانے لگیں۔

" اس چند کو کیا معلوم کہ ــ" شہید کو جیسے کوئی بات سوجھی "چلیئے۔ نواز یہی بتا دے کہ آنکھوں کا جو سفید حصہ ہوتا ہے وہ جوان عورت کے معاملے میں ہلکا ہلکا نیلا رنگ کیوں اختیار کر لیتا ہے۔ میں اسے چیلنج کرتا ہوں۔ بتائیے۔"

"یعنی میں یہ بتاؤں کہ سمندر کیوں نیلا ہوتا ہے؟" رب نواز "خود" بولا اور ساری محفل کروٹ سی بدل کر رہ گئی۔ نشین تو تڑپ اٹھی۔ اس نے اپنا لمبا ننگا بازو پھیلا کر رب نواز کے گلے میں سانپ کی طرح لپیٹ لیا اور سہما ہوا رب نواز اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

بیگم نورالہدٰی کی آنکھ میں یکایک شاید ایک پلک گر گئی۔ قریب بیٹھے ہوئے شہید سے انہوں نے کہا۔ "ذرا دیکھئے تو، میری آنکھ میں کیا ہے؟"

شہید نے بیگم نورالہدٰی کی آنکھ میں جھانکا اور پھر بڑی متانت سے بولا۔

"آپ کی آنکھ میں سمندر ہے۔"

محفل چہک اٹھی اور بیگم نورالہدٰی گھنگھرو بجانے لگیں۔

ادھر سے خالد، اس کی دلہن ثریا اور ثریا کی چھوٹی بہن عطیہ اپنے میزبانوں کے ہمراہ اندر آ گئے۔ سب مرد اٹھ کھڑے ہوئے مگر رب نواز نشیمن کے بازو میں جکڑا بیٹھا تھا اس لئے بیٹھا رہ گیا اور خالد بولا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کب سے پی رہے ہیں؟ یہ سوال مجھے ایک تو اس لئے پوچھنا پڑ رہا ہے کہ کہیں میرے حصّے کی وہسکی کا صفایا تو نہیں ہو چکا؟ اور دوسرے اس لئے کہ آج مجھے نواز کے مزاج ناساز معلوم ہوتے ہیں۔ اور نشیمن بی بی دکھائی دے رہی ہیں مگر معلوم نہیں ہو رہی ہیں۔"

"ارے ان کے ساتھ تو عطیہ بھی ہے!" بیگم نورالہدیٰ نے ایک باچھ سے مسکرا کر شہید سے سرگوشی کی مگر شہید نے جواب میں اپنا کان کھجا لیا اور بیگم کی باچھ سمٹ کر اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔

"دیکھئے بھئی خالد صاحب۔" نشیمن نے رب نواز پر سے بازو ہٹاتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے تازہ تازہ شادی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کو مجھ پر ذاتی حملہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مجھے آج تک ایک بھی ایسی ڈرنک پارٹی یاد نہیں ہے جس میں میں اپنے پاؤں سے چل کر اپنی کار تک نہ پہنچی ہوں۔ یہ وہسکی شروع کرنے سے پہلے کی بات کر رہی ہوں۔ اس کے مقابلے میں کیا حضور کو عرفان صاحب

کے ہاں کی وہ پارٹی یاد ہے جو ابھی دس روز پہلے، آپ کی شادی سے
یہی کوئی تین روز پہلے ہوئی تھی۔ اور جس میں آپ نے ان کے دس ہزار
کے ایرانی قالین کو اُگال دان بنا لیا تھا؟"

بیگم نورالہدیٰ نے اکٹھے بہت سے گھنگھرو چھنکا دیئے اور بیگم حمید
نشیمن کو خاموش کرنے کے لئے بڑھیں مگر خالد نے اپنے تیور بدلے بغیر
کہا۔ "تو کیا آپ کے خیال میں یہ کوئی بہت بُری بات ہے؟ وہ تو خیر
گزری کہ بات وہیں متلی تک ختم ہو گئی ورنہ اس روز تو میں پی پی کر مر جانے
کا ارادہ کر کے آیا تھا۔"

ثریا نے سر کے ایک جھٹکے کے ساتھ پلٹ کر خالد کو دیکھا اور عطیہ نشیمن
کو بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی جو اپنے نئے پیگ میں رب نواز سے سوڈا
ڈلوا رہی تھی۔

"کیوں کیا بات تھی اس روز؟" بیگم نورالہدیٰ نے اپنی ایک
باچھ کو پھیلا کر پوچھا۔ "خیریت تو تھی؟"

خالد بولا۔ "جی ویسے تو بہمہ وجوہ درجہ بدرجہ خیریت ہی تھی لیکن
بعض اوقات روز روز کی خیریت بھی تو بور کر دیتی ہے ــ کر دیتی ہے نا؟"

اس پہ سوائے بیگم نورالہدیٰ اور چند دوسرے اصحاب کے، سب
ہنسنے لگے۔ یہ چند دوسرے اصحاب وہ اصحاب تھے جو چند پیگ پینے

کے بعد آدھے مرجاتے تھے۔ یا بہت زیادہ رقیق القلب ہو جاتے تھے، اور دوسروں کی باتوں میں کسی ایسے اشارے کی تاک میں رہتے تھے جس پر وہ زار زار رو سکیں۔ الیس محمد عارف سیٹھ بھائی بھائی اور مسٹر رنیلڈ مسیح اسی نوعیت کے اصحاب تھے البتہ ہمارے دوست عرفان پر نیم غنودگی کا عالم طاری ہو جاتا تھا اور وہ کبھی کبھی جیسے نیند سے چونک کر اپنی زندگی کا ثبوت بہم پہنچاتا رہتا تھا۔

ہنسی رکی تو خالد بولا "دو بھئی حمیدہ دیر اس لئے ہو گئی کہ ہم دونوں چلے آتے تو عطیہ اکیلی رہ جاتی۔ آج کل ان کا سارا ٹبر پشاور گیا ہوا ہے آدھا گھنٹہ عطیہ کو یہ سمجھانے میں گزرا کہ حمید کے ہاں تکلف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر وہ برابر تکلف کرتی رہی۔ پوچھیے تو اس سے۔"

"اب خدا کے لئے ہمیں شرمندہ تو نہ کیجیے" بیگم حمید شرما کر بولیں

"شیم شیم" عرفان نے تپائی کو تھپتھپا کر کہا۔ وہ کسی زمانے میں اسمبلی کا رکن رہ چکا تھا۔

"اگر عطیہ نہ آتی تو ہماری لڑائی ہو جاتی" حمید بولا۔

"لڑائی ہی کے ڈر سے تو آ گئی ہوں" عطیہ ہنس کر بولی۔

"لڑائی کا ذکر نہ کیجیے حمید بھائی" ثریا نے مسکرا کر کہا "دو تیسری عالمی جنگ سر پہ کھڑی ہے۔ اللہ اللہ کیجیے۔"

"ماشاءاللہ۔ الحمدللہ۔ انشاءاللہ" عرفان ذکر کرنے لگا۔

ثریا اور عطیہ خاص مہمانوں کے صوفے پر نشستیں اور رب نواز کے بالکل مقابل جا بیٹھیں۔ خالد کے لئے بہت سی جگہیں خالی کر دی گئیں مگر وہ یہ کہتا ہوا خاص صوفے کے ایک سرے پر ثریا کے پاس بیٹھ گیا کہ "حضرات شاید آپ نشے میں مشغول رہے ہیں کہ یہ دعوت میرے اعزاز میں دی جا رہی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ عام مہمانوں کی طرح دو چار پیگ پر ٹرخا دیا جاؤں۔ میں تو اپنے حصے کی پوری بوتل پیوں گا اس لئے یہاں اپنی منسز کے پاس بیٹھوں گا۔"

سب ہنسے۔ پھر حمید نے وائٹ ہارس کی سچ مچ پوری بوتل اس کے سامنے رکھ دی۔ خالد نے اپنا دگنا پیگ بنایا اور دور سے آنے والے پیاسے مسافر کی طرح ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ ثریا کے گلاس میں شیری ڈالنے کے بعد حمید نے بوتل عطیہ کے گلاس پر جھکائی تو عطیہ نے گلاس پر ہاتھ رکھ دیا اور مسکرا کر حمید کو دیکھنے لگی۔ حمید نے پوچھا "کیا یہ شربت نیلوفر بھی چھوڑ دیا گیا ہے؟" مگر عطیہ نے ثریا کی گود پر سے اپنا بازو گزار کر گلاس خالد کے سامنے بھیک کے پیالے کی طرح رکھ دیا۔ وہ اپنا دوسرا پیگ بناتے ہوئے رک گیا اور بڑی وحشت سے عطیہ کو دیکھنے لگا مگر عطیہ اپنی بہن کی گود میں آدھی لیٹی ہوئی مسکرا رہی

رہی اور بولنے کے بجائے اپنا گلاس ہلاتی رہی۔ ثریا نے اسے ہٹانے کی بھی کوشش کی اور یہ کہہ کر ڈانٹا بھی کہ "وہ پاگل ہو گئی ہے کیا؟" مگر یکایک ساری محفل نے تالیاں بجا دیں۔ یہ تالیاں اس وقت تک بجتی رہیں جب تک دم بخود خالد نے عطیہ کو ایک پیگ تیار نہ کر دیا۔ عطیہ بڑے اطمینان سے وہسکی سپ کرنے لگی اور ساری محفل نے اپنے جام بلند کر کے عطیہ کی مستقل مزاجی کی داد دی اور شراب نوشی کے معاملے میں اس کی استقامت کی دعا مانگی۔ خالد اور ثریا حیران بیٹھے سب کچھ سنتے اور دیکھتے رہے۔ پھر یکایک خالد نے شعوری طور پر سنبھالا، دوسرا پیگ پیا، سگریٹ سلگایا اور جیسے ذہن کی دھول جھاڑنے کے لئے بولا۔

"ہاں تو رب نواز تمہارے تیوروں سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم پانچ چھ پیگ چڑھا چکے ہو۔ اس لئے کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہو۔"

"جی ہاں" شہید بولا "قبلہ رب نواز صاحب محبت کے مسئلے پر اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید اور مستفیض فرما رہے تھے۔"

"یہ تو بڑا نازک مسئلہ ہے نواز" خالد نے کہا۔

"یہ جو شہید ہے نا" رب نواز نے خالد کو بتایا "یہ از روئے نفسیات محبت کی دنیا کا یتیم ہے اس لئے وہ صاف جھوٹ بولا ہے بحث شادی کی عمر پر ہو رہی تھی لیکن اب اس نے کہا ہے تو چلو محبت

پر بحث کئے لیتے ہیں۔ اسی سے کیجئے شروع کرے۔"
شہید بولا "آپ اپنے بائیں طرف سے شروع کرو۔"
رب نواز چونکا بھی اور مسکرایا بھی "میرے بائیں طرف تو مس نشیمن بیٹھی ہیں۔"
"میں کیا عرض کروں گی" نشیمن بولی۔ "ان سے پوچھیے جنہوں نے شادیاں کر لی ہیں"
"محبت کرنے کے لئے شادی کرنا ضروری نہیں ہوتا۔" شہید نے رائے ظاہر کی "نواز سے پوچھ لیجئے۔"
"ہاں ہاں" نواز بولا "میں شہید سے زندگی میں پہلی بار متفق ہو رہا ہوں۔ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان شادی کرنے کے لئے محبت کرے مگر شادی نہ کر سکے اور عمر بھر محبت ہی کرتا رہے۔ یوں بھی ہوتا ہے۔"
"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔" عرفان نے بازو پھیلا کر مصرع پڑھا
شہید، رب نواز اور میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی صاحب محبت کے مسئلے پر کچھ بولیں مگر سب کتراتے اور ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے رہے اور اس دوران میں خالد نے چار اور عطیہ نے دو

پیگ چڑھا لیے۔ عطیہ نے ثریا کی گود سے ہاتھ گذار کر خالد کے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ بھی نکال لیا۔ حمید نے سگریٹ لائیٹر جلایا اور تالیوں کے درمیان عطیہ لمبے لمبے کش لینے، کھانسنے اور ہنسنے لگی یکایک ثریا نے عطیہ کی انگلیوں سے سگریٹ نوچ کر ایش ٹرے میں پھینک دیا مگر عطیہ اسی طرح کھانستی اور ہنستی رہی۔

اچانک نشیمن بولی۔ "بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ محبت کے مسئلے پر تو خالد صاحب ہی بہتر رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔ تازہ بتازہ قصہ ہے۔ کل شام ہی کوہ ہنی مون سے لوٹے ہیں۔ آپ بیتی کا معاملہ ہے۔ یا اگر آپ سب لوگ متفقہ طور پر قرار داد منظور کر لیں تو ثریا سے درخواست کی جائے کہ وہی اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں"

"کیر ہیئر، ہیر ہیئر" عرفان نے تائید کی ڈھیلی ڈھالی تالی بجائی۔

"جی مجھے تو بخشیئے" ثریا نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور پھر خالد کے کندھے سے کندھا لگا کر بیٹھ گئی۔

"عطیہ تو خیر کیا بتائیں گی" نشیمن مسکرائی۔

"عطیہ تو خیر ابھی بہت چھوٹی ہیں" بیگم نورالہدیٰ بھی مسکرائیں۔

مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے ہنسنے لگیں اور ہنستی چلی گئیں۔ پھر نشیمن کو بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ دونوں ہنسی پر ضبط پانے کی کوشش کرر

کر رہی تھیں مگر ان کی ہنسی ضبط کے بند توڑ توڑ کر نکل رہی تھی، اس بے سبب ہنسی پہ محمد عارف، بھائی بھائی اور رینلڈ مسیح تک چونک پڑے اور عرفان یوں گھبرایا گھبرایا سا دکھنے لگا جیسے دونوں خواتین اسی پہ ہنس رہی ہیں۔ سب کو جیسے عطیہ کے چیخیں مار کر رو دینے کا انتظار تھا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ دونوں کو بہت شوق ہے میری محبت کی کہانی سننے کا۔" عطیہ کے لہجے میں طنز تھا۔ "مگر آپ تو سننے سے پہلے ہی محظوظ ہوئی جا رہی ہیں۔"

بیگم نورالہدیٰ اور نشیمن کی ہنسی ایک دم رک گئی اور کمرے کا ماحول سخت رقیق ہو گیا۔

"تو پھر سنائیے" نشیمن نے ہمت کی۔

"شوق سے سنیئے" عطیہ بولی "اگر آپ ———"

"عطیہ بی بی، ہپ ہپ ہرّا۔" عرفان نے گلاس والا ہاتھ اٹھا کر نعرہ مارا۔

عطیہ بولتی رہی "اگر آپ سب لوگ ایمانداری کے ساتھ اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر اپنی اپنی محبت کا حال سنانے کو تیار ہوں تو میں بھی حاضر ہوں۔" عطیہ نے بڑی متانت سے اتنے بہت سے لوگوں کو چیلنج کر دیا۔

"اور اگر کسی نے محبت کی ہی نہ ہو؟" نشمین نے پوچھا۔

"نان سنس۔" عرفان بڑبڑایا۔

عطیہ فوراً بولی۔ "اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس نے محبت کی ہی نہیں تو اس کے لئے بہتر صورت یہ ہے کہ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ذرا زیادہ غور سے دیکھ لے۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ کوئی شخص زندگی میں کم سے کم ایک بار بقائمی ہوش و حواس، محبت میں اپنے ہوش و حواس نہ گنوا بیٹھے۔"

"عطیہ کہ ہماری ہنسی بری لگی حالانکہ کم سے کم میں تو اس پر نہیں ہنس رہی تھی۔" نشمین نے کہا۔ "میں تو اس بات پہ ہنس رہی تھی کہ جانے کیوں بعض لوگ ہنسنے پر آتے ہیں تو ان کی ہنسی رکتی ہی نہیں۔"

بیگم نورالہدیٰ بہت سنجیدہ ہو گئیں۔ پھر پرس میں سے آئینہ نکال کر ایک ننھے سے رومال سے اپنی پلکیں خشک کرنے لگیں۔

عطیہ نے نشمین کی معذرت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ بولتی رہی۔ "محبت گناہ نہیں ہوتی۔ ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ضرور ہوتی ہے۔ اور محفلوں میں کسی کی محبت کے بجائے کسی کی شادی کا اعلان زیادہ بھلا لگتا ہے۔ لیکن اگر آپ کو دوسروں کی شخصیتوں کو بے لباس کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو معقولیت کا تقاضہ یہ ہے کہ پہل خود کیجئے۔

دیکھیے آپ یہاں بیٹھی وہسکی بھی پی رہی ہیں۔ اور غیر مردوں کے گلے میں باہیں بھی ڈال رہی ہیں۔ پھر اگر آپ کو اس میں کوئی جھجک نہیں تو یہ بتانے سے کیوں جھجک رہی ہیں۔ کہ آپ محبت کی بالکل نیچرل ارج کے ہاتھوں کہاں اور کیسے مجبور ہوئی تھیں۔"

جب تک عطیہ بولتی رہی، سب لوگ گم سم بیٹھے رہے۔ نشیمن بھی جیسے سناٹے میں آگئی۔ پھر جب عطیہ بول چکی۔ تو سب کو ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی فرصت ملی۔ خاموشی کا یہ لمحہ بہت مختصر تھا مگر بہت بھدا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ لمحہ ایک ٹھوس مری چیز بن کر سب کے سینے میں گڑ گیا ہے۔

شہید نے ہمت کی شگفتہ سا لہجہ اختیار کر کے بولا "بسم اللہ رب نواز سے ہونی چاہیئے۔" رب نواز دائیں بائیں دیکھنے لگا تو شہید بولا "وہ نہیں بیٹا۔ آج تو بہت بُرے پھنسے۔ آج تو تمہیں اپنے فلسفے کا مرہم ہٹا کر اپنا زخم دکھانا ہوگا۔ آج تو میری جان کوئی نہ کوئی جھوٹ، نرا تشنا ہی ہوگا اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر۔"

"ٹھہریئے حضرات، ٹھہریئے" بیگم حمید اٹھ کھڑی ہوئیں "آپ لوگ ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیئے گئے ہیں اس لیے بحیثیت میزبان میرا فرض ہو جاتا ہے کہ ابتدا میری طرف سے ہو۔"

"مگر کیا سب لوگ اس اعتراف کے لیے تیار بھی ہیں؟" خالد
نے اعتراض کیا اور ثریا نے تائید میں یوں بے ساختہ سر ہلایا۔ جیسے
پہلی بار کسی نے اس کے دل کی بات کی ہے۔

سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

نشیمن نے وہسکی پی تو چند قطرے اس کی باچھوں سے بہہ کر
اس کی ٹھوڑی پہ جمع ہو گئے اور پھر گردن سے ہوتے ہوئے غائب ہو گئے۔

"میں تیار ہوں۔ میرا باپ تیار ہے۔ میرا دادا تیار ہے۔" عرفان یکایک
کھڑا ہو گیا مگر پھر جھول کر صوفے پر گر گیا اور اسی گری ہوئی حالت میں
مسکرانے لگا۔ اور ایک ہاتھ بلند کر کے یوں ہلانے لگا جیسے اس کی بات
ابھی تک جاری ہے۔

خالد پھر بولا "سب لوگوں کے تیور بتا رہے ہیں۔ کہ سب تیار
نہیں ہیں اس لئے چلیئے باتوں کے لئے کوئی اور موضوع چنیں۔"

"کھانا ہی کیوں نہ کھا لیا جائے۔" حمید نے تجویز پیش کی اور
پھر کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر پکارا۔ "خانساماں۔ کھانا
لگا دو۔"

خالد بولا "مس نشیمن ہی اس قصے کو ختم کرنے کا اعلان کریں
اور کوئی نیا موضوع بھی تجویز کریں مثلاً دنیا کا بدلتا ہوا موسم۔ کیوبا اور

کانگو۔ خلا کا سفر۔ مریخ کی مخلوق۔"

"جی نہیں۔" عطیہ آگے کھسک کر صوفے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔
"نشیمن نے بڑے طنز سے جو اشارہ کیا تھا اس کا مطلب میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں، میں تو ان کی ہنسی کی۔ بان بھی سمجھ گئی تھی۔ میں مصر ہوں کہ سب اپنی اپنی محبتوں کی کہانی سنائیں اور اگر کوئی جھوٹ بولے تو اسے ٹوک دیا جائے۔"

"ہوش میں تو ہو عطیہ؟" خالد نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔

"پاگل ہے۔" ثریا بی بی اور عطیہ کا تیرا پیگ اس نے سامنے سے اٹھا کر تپائی کے نیچے رکھ دیا۔

عطیہ نے جیسے اپنی بہن اور بہنوئی کی بات سنی ہی نہیں۔ بولی، "ہاں تو نشیمن صاحبہ۔ اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر اپنی آپ بیتی شروع کیجئے مگر یاد رکھیے کہ آپ جھوٹی قسم کھائیں گی تو آپ کی سب سے پیاری چیز جاتی رہے گی۔"

"ہائے اللہ یہ لڑکیوں نے کیسی فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔" بیگم شفقت ہی نے جو بار بار بالواسطہ طور پر اپنی بیٹی کے حق میں [illegible] کہا

رب نواز ہاتھ میں بوتل لئے اٹھا۔ توازن قائم رکھنے کے لئے ٹانگیں پھیلا دیں اور بولا "دو کیا پینے اور بولنے کے دونوں کام اکٹھے

نہیں ہو سکتے ۔ یہ بہت غلط بات ہے کہ باتوں میں پینے کا دور رُک گیا ہے۔"

پینے میں صرف نشیمن نے رب نواز کا ساتھ دیا۔

رب نواز نے آخری گھونٹ لے کر کہا "خواتین و حضرات۔ سب سے پہلے مجھے فارغ ہو لینے دیجئے ورنہ جب تک آپ لوگ بولیں گے، یہ اعتراف میرے سینے پر ایک بوجھ بنا رہے گا۔"

سب رب نواز کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولا "میں اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے محبت کی ہے۔ اور آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے کس سے محبت کی ہے۔ میں نے بوتل سے محبت کی ہے۔"

"بڑا بوگس آدمی ہے۔ مگر سچ بولا ہے۔" شہید نے کہا اور لوگوں نے چند ہلکے ہلکے قہقہے لگائے۔ رب نواز دائیں بائیں آگے پیچھے جھومتا ہوا بیٹھ گیا اور مسکرا کر نشیمن کو دیکھنے لگا۔

پھر بیگم حمید اٹھیں۔ "میں حمید کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے حمید سے محبت کی اور اسی سے شادی کر لی۔"

"کھیل ختم پیسہ ہضم۔" شہید بولا۔

"آپ نے تو حمید کی زبان ہی کاٹ لی۔" میں نے کہا۔

سب ہنسنے لگے مگر سب کی ہنسی کھوکھلی اور مرجھائی ہوئی تھی۔

شہید نے اپنی ایک درجن محبتوں کے واقعات خوب کھل کر سنائے۔ اس نے بتایا کہ "بھئی ہم یاروں نے تو مل کر محبت کا باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا رکھا ہے۔ کہ ایک لڑکی سے ایک دوست دوپہر تک محبت کرے تو اسی لڑکی سے دوسرے دوست کی محبت دوپہر سے شام تک ہو۔ اور تیسرے کی شام سے سینما کے آخری شو تک۔ اور یہ ٹائم ٹیبل اتنا مکمل ہے کہ میری زندگی کی پٹڑی پہ گاڑیوں کے تصادم کا ایک بھی حادثہ نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ متعلقہ لڑکیوں نے بھی یہی پروگرام بنا رکھا ہوتا ہے" آخر میں اس نے کہا "بس ایک محبت ذرا سی گڑبڑ ہو گئی۔ میں معافی چاہتا ہوں مگر میں نے اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھائی ہے اس لئے یہ بتانا ہی پڑے گا کہ اسی محفل میں ایک ———"

حمید تقریباً چلا اٹھا "نہیں شہید یہ غلط ہے۔ کلچرڈ لوگ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔"

یکایک بیگم نورالہدیٰ نے ٹھنڈا سادہ پانی مانگا تو نواز بولا "سادہ پانی؟ اس محفل میں؟ آپ تو شیری پی رہی تھیں!"

"مجھے پیاس لگی ہے" بیگم نورالہدیٰ کی آواز بدلی ہوئی تھی "سادہ پانی منگا دیجیے۔"

عرفان کی آواز آئی "سادہ پانی۔ ٹیپ واٹر۔ ایکوا پیورا۔"

بیگم شفقت الٰہی تک نے اعتراف کر لیا کہ انہوں نے شادی سے پہلے نشمین کے تایا سے محبت کی مگر ان کی شادی نشمین کے ڈیڈی سے ہو گئی اس لیے ان سے محبت کرنے لگیں۔ اب وہ مر چکے ہیں لیکن اگر آج نشمین کے تایا زندہ ہوتے تو ان کی محبت میں تازگی آ جاتی مگر قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

میں نے اپنی محبت کا قصہ سنایا تو سب بے حد محظوظ ہوئے اور محفل میں شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے ایک ہی محبت کی تھی اور میری محبت کے یہی کھنڈر اب تک میری پناہ گاہیں تھے "ایک ہی محبت" کا یہ واقعہ سب کے لیے ایک لطیفہ ثابت ہوا اور مجھے "محبت کا افلاطون" اور "مجنون ۱۹۶۰ء" کی قسم کے القاب سے نوازا جاتا رہا۔

"ایک ہی محبت کی بات تو ایسی ہی ہے جیسے انسان زندگی میں صرف ایک بار کھانا کھائے اور عمر بھر ڈکاریں لیتا رہے۔" شاہد بولا اور سب لوگ خوب ہنسے۔

اب بیگم نورالہدیٰ کی باری تھی۔ وہ سادہ پانی ایک ایک گھونٹ پی رہی تھیں۔ ساری محفل ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر انہوں نے گلاس تپائی پر رکھ دیا اور بت بن کر بیٹھ گئیں۔ نشمین نے ایک بار

انھیں بلایا تو جواب میں ان کے ہونٹ ہلے مگر کانپنے لگے۔ پھر وہ رونے لگیں۔ خاصی بلند آواز سے رونے لگیں۔ مرد گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے مگر ان میں سے بیشتر لڑکھڑا کر صوفوں پہ گر پڑے۔ شہید مسکرانے لگا۔ بیگم شفقت الٰہی اور نشیمن تو ہنس دیں مگر ثریا اور عطیہ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ بیگم حمید نے لپک کر بیگم نورالہدیٰ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ پھر عطیہ بولی "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ بیگم صاحبہ کو اعتراف سے معاف کر دیا جائے؟"

یہ تجویز آنکھوں ہی آنکھوں میں منظور کر لی گئی۔

"آپ لوگوں نے سب سے پیاری چیز کی قسم نہ دی ہوتی تو میں ضرور بتا دیتی"۔ بیگم نورالہدیٰ نے بچوں کی طرح سسکتے ہوئے کہا اور اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئیں۔ بیگم حمید ان کے پیچھے دوڑیں۔ ان کے جانے کے بعد چند لوگ ہنسے۔

شہید نے چپکے سے احتجاج کیا "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ذرا سا رو دینے سے خلاصی ہو جاتی ہے تو مجھے اپنے معاشقوں کی فہرست مرتب کرنے کی کون سی ضرورت ماری جا رہی تھی"۔

وہسکی اور شیری کا ایک اور دور چلا۔ عطیہ نے تپائی کے نیچے سے اپنا گلاس اٹھا لیا اور ثریا بے بسی سے دیکھتی رہی۔ بیگم نورالہدیٰ منہ دھو

کرا ور میک اپ درست کر کے بیگم حمید کے ساتھ واپس آگئیں تو رب نواز صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے بولا "اب مس نشیمن کی باری ہے"

"نشیمن اچھا نام ہے" عرفان آنکھیں بند کیے بولا "عرفان بھی اچھا نام ہے۔ تمھارا بھی اچھا نام ہے۔ ہمارا بھی اچھا نام ہے" پھر وہ گانے لگا "نام منظور ہے تو پل بنا، چاہ بنا، مسجد بنا، تالاب بنا"

نشیمن کی بڑی بڑی، باہر ابلی پڑتی ہوئی آنکھوں کی پتلیاں اوپر ہو کر پپوٹوں میں آدھی آدھی چھپ گئی تھیں۔ اس کا رنگ انگارہ ہو رہا تھا۔ ناک کے بانسے، نچلے ہونٹ کے خم اور گردن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس نے آدھا بھرا ہوا گلاس یوں تھام رکھا تھا جیسے وہسکی کو ایک پتلی دھار میں فرش پر گرانے کی سوچ رہی ہے۔ وہ اٹھی۔ ذرا سی جھینپی۔ پھر بولی۔ "جی ہاں۔ میں نے محبت کی ہے۔ عطیہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم سب نے محبت کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے محبت کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ میں ایک سے محبت کر رہی ہوتی ہوں کہ اس دوران میں مجھے دوسرے سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ پہلا مجھ سے سبے وفائی کر جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو بھلا دینے کے لئے تیسرے آدمی سے محبت کرنے لگتی ہوں مگر پھر کہیں سے چوتھا آجاتا ہے۔ اپنی اٹھائیس برس کی عمر میں ———"

"اٹھائیس برس؟" رب نواز بے ساختہ چیخا۔ "ابھی ابھی تو آپ کی ممی ———"

"جی ہاں" نشیمن نے رب نواز کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اپنی اٹھائیس برس کی عمر میں، اتنی محبتیں کی ہیں میں نے، کہ شمار کرنے بیٹھوں گی تو کہیں کہیں غلطی ضرور ہو جائے گی۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں محبت کرتے کرتے بور ہو چکی ہوں اب میں نفرت کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے رک کر ایک گھونٹ بھرا۔

"نفرت کرنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔" رب نواز بولا۔ "کہیں یہ نہ ہو کہ آپ چلی تو ہوں نفرت کرنے اور واپس آئیں تو آپ کو محبت ہو چکی ہو۔ دوستوفسکی کے ایک ناول میں ———"

"آپ بیکار ہی بار بار فکر کرتے ہیں۔" نشیمن نے رب نواز کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اطمینان رکھیئے کہ آپ سے میں نہ تو محبت کرتی ہوں نہ نفرت کرتی ہوں۔ نفرت بھی اسی سے کی جاتی ہے جس کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ وہ آخری آدمی جس سے میں نے محبت کی ہے۔ میری نفرت کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔"

اب نشیمن نے ان لوگوں کے نام، عہدے، سماجی مرتبے، پتے بلکہ ان کے بچوں کی تعداد تک بتا دی جن سے اس نے محبت کی تھی۔ آخر میں اس نے کہا۔ "میں آخری آدمی کا نام نہیں لوں گی اور امید ہے عطیہ کو اس پر کوئی

اعتراض نہ ہوگا۔ دراصل اس آخری محبت نے میرا بیلنس ذرا سا بگاڑ دیا ہے۔ اور میں وہسکی کو بھی ہضم کر لیتی ہوں، میرا ارادہ تھا کہ اس آخری آدمی سے محبت نبا ہوں گی یعنی شادی کر لوں گی مگر اس دوران میں ہماری ممی کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔"

"بکواس مت کرو نشیمن۔" بیگم شفقت الٰہی چیخ اٹھیں۔

"کھانا لگا دیا صاحب" خانساماں کی آواز آئی مگر اس کی طرف بیگم حمید تک متوجہ نہ ہوئیں۔

نشیمن اپنی ماں کی طرف دیکھے بغیر بولتی رہی "میں پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ابھی تک پرانے قبائلی لوگوں کی طرح اپنی ماں کی عزت کرتی ہوں اس لئے میں نے اپنی آخری محبت کی قربانی دے ڈالی ہے اور ممی کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔"

بیگم شفقت الٰہی آپے سے باہر ہو کر لڑکھڑائی ہوئیں تو تپائی الٹ گئی اور بوتلیں اور گلاس ایک دوسرے سے بجتے ہوئے قالین پر لڑھک گئے

"بے شرم" وہ کڑکیں۔

"نان سنس" عرفان نشے میں بکا۔

نشیمن وہسکی پینے لگی اور اس کی امی نے دھب سے بیٹھ کر شیری کا ایک گلاس جیسے ایک انتقامی جذبے کے ساتھ اپنے اندر انڈیل لیا۔

"خالد صاحب" نشمین گلاس خالی کر کے پکاری۔

"جی" خالد یوں بولا جیسے اسے اپنے پکارے جانے کی توقع نہ تھی۔

"ربّ اللّٰہم" نشمین بولی۔

"میرا قصّہ تو مختصر سا ہے" خالد نے پہلو بدل کر وہسکی کا گلاس اٹھا لیا اور اسے انگلیوں میں گھمانے لگا۔

"اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر بتائیے۔" نشمین نے مشورہ دیا۔

"جی عرض کرتا ہوں" خالد نے ذرا سا ناگواری سے کہا۔ پھر اپنے سامنے بیٹھی دلہن کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا "میری محبت کا نتیجہ تو آپ کے سامنے ہے۔ یہاں تو پہلے ہی سب بتا چکا ہوں" اس نے ثریا کی طرف دیکھا اور وہ ایک لمبی سانس لے کر مسکرانے لگی۔

"یہی بات ہے؟" نشمین نے پوچھا۔

"تو اور کیا بات ہے؟" خالد بولا "میری شادی میں تو یہ سب حضرات شریک تھے۔ ان سے پوچھ لیجئے۔ اخبارات میں ہم دونوں کی تصویریں بھی چھپی تھی۔"

"یعنی آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتائیں گے؟" نشمین بولی۔

"اس سے زیادہ کا مطلب کیا ہوا؟" خالد نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ ہے" اچانک عطیہ بولنے لگی "کہ کیا آپ اپنی سب سے

پیاری چیز کی قسم کھا کر بس اتنا ہی بتائیں گے؟"
خالد اور ثریا نے عطیہ کو ایک ساتھ دیکھا۔
نشیمن بولی۔ "اب فرمایئے۔"
"آپ تو حد کرتی ہیں۔" خالد ہنسنے لگا۔
عطیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالد کو دیکھنے لگی۔
"اور ثریا صاحبہ ــــ آپ؟" نشیمن نے پوچھا
"جی میں تو پہلے سے عرض کر چکی ہوں کہ مجھے بخشیئے" ثریا بولی۔
"ہاں ہاں" عرفان بولا۔ "ٹھیک ہے۔ انھوں نے کہہ دیا تھا۔
ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ واقعی کہہ دیا تھا۔ ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے"
"اور عطیہ۔ آپ؟" نشیمن بولی۔
"کھانا لگا دیا صاحب۔" خانساماں کی آواز آئی۔
"آپ بھی کیا یہی بہانہ کریں گی؟" نشیمن نے پوچھا۔
"جی نہیں۔" عطیہ بولی۔ اس کا چہرا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ اور اس کی انگلیوں میں کپکپی تھی۔ "میں عرض کرتی ہوں۔ میں اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولوں گی خالد بھائی کی طرح۔"
ثریا نے یوں تیزی سے پلٹ کر عطیہ کو دیکھا جیسے اسے مار ڈالے گی پھر اس نے خالد کی طرف دیکھا اور خالد عطیہ کو دیکھنے لگا۔

"تو کیا آپ نے محبت کی ہے؟" نشیمن وکیلوں کے سے لہجے میں بولی۔

"جی ہاں" عطیہ جیسے عدالت میں کھڑی تھی۔

"کس سے؟" نشیمن نے پوچھا۔

یکایک حمید بول اٹھا "دیکھیے مس نشیمن۔ طے پا چکا ہے کہ اس قسم کے پرسنل سوال کا جواب کوئی دینا چاہے تو ٹھیک ہے ورنہ کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"خالد بھائی سے" عطیہ بولی "میں نے خالد بھائی سے محبت کی ہے۔ پوچھ لیجیے ان سے۔"

ساری محفل کے سینے پر جیسے کسی نے گھونسا دے مارا۔

"بکومت عطیہ" ثریا چیخ اٹھی "شرم نہیں آتی کمینی کو کہ ———"

خالد نے ثریا کے منہ پر بڑی سختی سے ہاتھ رکھ دیا اور بولا "یہ کیا بک بک ہے ثریا۔"

"خالد بھائی اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر جھوٹ بول گئے۔" عطیہ سحر زدوں کی طرح بول رہی تھی "وہ میری قسم کھا کر جھوٹ بول گئے مگر میں ان کی قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ وہ جگ جگ جئیں۔ میں ان کی جھوٹی قسم کیوں کھاؤں؟"

"پوائنٹ آف آرڈر۔ پوائنٹ آف آرڈر" عرفان پکارا۔

محمد عارف، بھائی بھائی اور رنیلڈ مسیح اپنے آنسو پونچھنے لگے۔

"خالد بھائی" عطیہ بولتی رہی "ثریا باجی سے شادی کرنے کے بعد آپ نے مجھ سے یہ دوسری بے وفائی کی۔"

"میں تمہارا منہ نوچ لوں گی عطیہ" ثریا، عطیہ پر جھپٹی مگر خالد نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف سمیٹ لیا۔

عطیہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے گالوں پر آئے اور تیزی سے اس کی گود میں گر گئے۔

بیگم نورالھدیٰ اونچی اونچی رونے لگیں۔

"میں بارہ برس کی تھی جب میں نے خالد بھائی کو چاہا" عطیہ کی آواز بھرائی اور گھٹی ہوئی تھی۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ عمر کی کوئی قید نہیں" رب نواز خوش ہو کر بولا۔

"بکومت" شہید نے اسے ڈانٹ دیا۔

"اب میں بیس برس کی ہوں" عطیہ کہہ رہی تھی "میں آٹھ برس سے محبت کر رہی ہوں مگر باجی نے آٹھ دن کی محبت کے بعد انہیں مجھ سے جیت لیا۔"

"عطیہ" ثریا نے عطیہ کو جیسے گالی دی۔

بیگم نورالھدیٰ لپک کر باتھ روم میں چلی گئیں۔

عطیہ بولے جا رہی تھی۔ "مجھے ابّا اور امّی نے بتایا کہ شادی پہلے بڑی بیٹیوں کی ہوتی ہے اور بڑوں کو محبت کرنے کا بڑا حق حاصل ہوتا ہے۔ مجھے خالد بھائی نے بتایا کہ تمھیں حاصل نہ کر سکنے کے باوجود تمھارے قریب رہنے کا یہی تو ایک بہانہ باقی رہ گیا ہے کہ میں تمھاری باجی سے شادی کر لوں۔"

اچانک ثریا نے خالد کی گرفت سے چھوٹ کر عطیہ کے منہ پر تڑاخ سے تھپڑ دے مارا۔ ساری محفل ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی تو الٹتی ہوئی تپائی پر سے لڑھک کر بوتلیں اور گلاس چھناخ چٹاخ ہو کر ٹوٹ گئیں۔ خالد نے آگے بڑھ کر ثریا کا دوبارہ اٹھتا ہوا ہاتھ بڑی سختی سے پکڑا اور اسے ایک جھٹکے سے یوں پیچھے ہٹایا کہ وہ نشیمن کے صوفے کے بازو پر جا گری۔

"سپورٹسمین سپرٹ کا تو تم میں ایک ذرّہ تک نہیں!" خالد نے ملامت کی

اس دوران میں نشیمن نے عطیہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ اور وہ اس کے سر پہ گال رکھے آنسو بہا رہی تھی۔ بیگم حمید اپنے سینے پر ہاتھ باندھے، عطیہ کے پیچھے گم سم کھڑی تھیں اور روتی ہوئی بیگم نور الھدیٰ باتھ روم کے دروازے میں سے جھانک رہی تھیں۔ بیگم شفقت الٰہی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

رب نواز نے سگریٹ کا جلتا ہوا حصّہ ہونٹوں میں رکھ لیا اور پھر

اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ نوچ کر بیٹھ گیا۔

خالد عطیہ کے قریب گیا تو نشمین اُٹھ کر آنسو پونچھنے لگی۔ ایک لمحے کے بعد خالد عطیہ کے پاس بیٹھ گیا مگر فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ثریا کا رنگ مٹی ہو رہا تھا وہ جس صوفے کے بازو پر گری تھی وہیں بیٹھ گئی تھی اور خالد کو گھورے جا رہی تھی۔ یکایک خالد ایک دم عطیہ کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے ایک بازو میں سمیٹ کر اپنے پہلو سے دباتے ہوئے بولا "رحمت عطیہ۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں، میں تم سے اگلی پچھلی ساری غلطیوں کی معافی چاہتا ہوں۔"

ثریا لپک کر آئی اور خالد کے سر پر چیخی۔ "تم میری ہتک کر رہے ہو خالد۔ اور میں تم سے اس ہتک کا بدلہ لوں گی۔"

خالد بولا۔ "پہلے میں تم سے عطیہ کی ہتک کا بدلہ تو لے لوں۔"

ساری محفل نے ثریا کی چیخ کے انتظار میں سانس روک لی۔

"کیا ہُوا؟ طلاق ہو گئی؟" بیگم نورالھدیٰ باتھ روم میں سے حواس باختہ باہر آگئیں۔

"نان سنس!" عرفان بڑبڑایا۔

یکایک خانساماں کی آواز آئی۔ "کھانا لگا دیا صاحب۔"

(اکتوبر ۱۹۶۰ء)

فالتو

حبیب احمد کی شادی کے دسویں دن بعد ایک دوپہر کو لوگوں نے دیکھا کہ اس کا باپ سر پہ دو گھٹڑے رکھے اور قدم قدم پہ جھکتے ہوئے کڑے والا ایک صندوق بغل میں مارے، ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا لمبی گلی سے نکلا جا رہا ہے۔ یکایکی وہ پلٹ کر پکارا "ایڑی اٹھا کر چل نیکاں۔"

لوگوں نے گھوم کر دیکھا تو لمبی گلی کے سرے پر نیک بخت سر پہ ایک گٹھڑا اٹھائے آ رہی تھی۔

"یہ میاں بیوی کہاں چلے؟" لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا پھر ایک بوڑھے نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر بولا "کیوں بھائی پیر بخش، کدھر جا رہے ہو؟"

"کھیتوں پر" پیر بخش نے فوراً جواب دیا مگر لہجہ ایسا سوکھا تھا کہ بوڑھے کو دوسرا سوال پوچھنے کے لئے ایک پل رکنا پڑا۔

"وکھاٹ کھٹولے سمیت؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"ہاں"

"یعنی اب وہیں رہوگے؟"

"ہاں"

"یعنی گاؤں چھوڑے جارہے ہو؟"

"ہاں"

"کیوں؟"

"بس۔" پیر بخش یہ لفظ یوں بولا کہ بوڑھے کے سوالوں کا خزانہ یکایک ختم ہوگیا۔

اتنے میں نیک بخت بھی آپہنچی۔ اس کے گھٹنوں، ہاتھوں اور ہونٹوں پر رعشہ طاری تھا اور آنسو اس کی ایک ایک جھری میں پھیلے ہوئے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں تو وہ گھبرا کر پیر بخش کو دیکھنے لگی مگر دیکھتے ہی بلبلا کر رو دی۔ گٹھڑی کی میلی چادر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچتے اور مروڑتے ہوئے اس نے بھرائی اور بھنچی ہوئی آواز میں کہا: "ہم سے مت پوچھو۔ جاؤ بیٹے سے پوچھو جس نے ــــــ"

پیر بخش بیچ میں بول پڑا: "گھر چھوڑنے سے پہلے چھت پر چڑھ کر ہوکا کیوں نہ دے دیا کہ یوں جگہ جگہ ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"چل دے چل" نیک بخت، پیر بخش کی طرف اپنا ایک ہاتھ خنجر کی طرح بڑھا کر بولی اور چل پڑی۔

لمبی گلی کے نکڑ تک لوگ انھیں دیکھتے رہے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر سارے گاؤں میں گھوم گئی کہ شادی کے چوتھے ہی دن بعد حبیب کی دلہن اور حبیب کی ماں کی آپس میں ٹھن گئی۔ نیک بخت اپنے بیٹے کی موجودگی میں دلہن کے جہیز کے برتن آلوں اور پڑچھتیوں پر سجاتی پھر رہی تھی کہ شیشے کا ایک گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چینی کی ایک پلیٹ پر گرا اور دونوں ٹوٹ گئے۔ دلہن جو ساتھ والے کوٹھے میں، لڑکیوں میں گھری بیٹھی تھی، چھناکا سن کر اٹھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اور زیور چھنکاتی آئی۔ ایک پل کھڑی ٹوٹے ہوئے برتنوں کو گھورتی رہی اور پھر اس گھر میں آنے کے بعد پہلی بار بلند آواز میں بولی: "ماسی یہ تو میرے میکے کے برتن ہیں!"

"تیرے میکے کے ہیں تو میرے بیٹے کے بھی تو ہیں!" نیک بخت نے حبیب احمد کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

حبیب احمد بولا "میرے بھی ہوتے تو نئے برتنوں کے ٹوٹنے کا رنج تو ہوتا ہی ہے!"

اور نیک بخت یوں نظر آنے لگی جیسے گلاس اور پلیٹ کے ساتھ وہ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ شام کو اس نے شوہر سے شکایت کی۔ شوہر نے بیٹے سے

شکایت کی۔ بیٹا بڑی تیزی سے دلہن کے پاس گیا مگر جانے آپس میں ان کی کیا باتیں ہوئیں کہ واپس آیا تو باپ کے پاس چپکا کھڑا ہو گیا۔

پیر بخش نے ذرا سا انتظار کیا۔ پھر پوچھا "کیا کہتی ہے؟"

حبیب احمد نے ماں باپ کی طرف دیکھے بغیر کہا "کہنا کیا ہے بے چاری کو۔"

نیک بخت طنز سے بولی "نہیں نہیں بیٹا۔ کچھ تو کہتی ہو گی بے چاری۔"

"بے چاری!" پیر بخش یوں بولا جیسے غور کر رہا ہے۔

یکا یک حبیب احمد آنکھیں نکال کر بولا "تم کہو تو اسے طلاق دے دوں؟"

"میرے سامنے آنکھیں نہ نکال حبیبے" نیک بخت رونے لگی "کلی کر کے اپنے منہ سے میرا دودھ تو دھو لے پہلے"۔ ماں نے وار کیا۔

پیر بخش بولا "تیری شادی کے خرچے میں سے چند روپے بچ گئے ہیں سو میں کل قصبے جا کر تیری بوہٹی کو شیشے کا گلاس اور چینی کی رکابی لا دوں گا۔ اتنی سی بات ہے نا؟"

حبیب احمد باپ کو گھورنے لگا۔ پھر تیز تیز چلتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

پانچ دن چپ چاپ گزر گئے۔ بیٹے نے ماں باپ سے کوئی بات نہ کی ماں باپ بھی سہمے سہمے پھرتے رہے۔ وہ آپس میں بھی بہت کم بولے اور جب بولے تو بہت آہستہ جیسے اونچے بولے تو کچھ ٹوٹ جائے گا۔ رات کو جب وہ

صحن کے پرلے کونے میں دیوار کے پاس اپنے کھٹولے پر سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلنے اور سو نہ سکنے کے کرب کو دبانے کے لیے چت لیٹے آسمان پر ٹکٹکی باندھے رکھتے تو صرف اس وقت چولھانے کی حدِ فاصل سے ادھر، مقابل کی دیوار کے پاس بچھے ہوئے رنگین پلنگوں پر کھسر پھسر کی آوازیں آتیں۔

"باتیں کر رہے ہیں۔" نیک بخت جل کر سرگوشی کرتی۔

پیر بخش خاموش رہتا تو وہ پوچھتی "جاگ رہے ہو کہ مر گئے ہو؟"

"کیا ہے؟" پیر بخش اس کی طرف کروٹ بدل کر ناگواری سے پوچھتا۔

"میں کہتی ہوں باتیں کر رہے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کریں۔ آخر میاں بیوی ہیں۔"

"میں کہتی ہوں، آپس میں بولتے ہیں۔ ہم سے کیوں نہیں بولتے؟"

"پہلے آپس میں تو جی بھر کے بول لیں۔"

"سنو"۔ برتن ٹوٹنے کے پانچ دن بعد ایک رات نیک بخت نے کہا "جا کے گلاس اور رکابی خرید کر اپنی بہو کے منہ پر کیوں نہیں دے مارتے اتنے دنوں سے سوچ کیا رہے ہو؟"

پیر بخش بولا "سوچ رہا ہوں کہ بڑی چھوٹی بات ہے۔ خاتون کسی کنگلے گھر کی لڑکی تو ہے نہیں۔ یہ نہ ہو کہ میں تیرا حکم مانوں تو لڑکی عمر بھر ہمیں کمینہ سمجھتی رہے۔ آخر ہمیں اسی گھر میں تو جینا مرنا ہے۔"

"تم مرد لوگ یہ باتیں نہیں سمجھتے۔ بس تم گلاس اور رکابی لے آؤ۔"
"وہ لے آؤں گا۔"
"کل ہی جاکر لے آؤ۔ جب تک نہیں لاؤ گے، مجھے میرا بیٹا بھی غیر محرم لگتا رہے گا۔"

حبیب احمد کی شادی کا دسواں دن تھا جب صبح کی نماز کے بعد پیر بخش قصبے گیا اور دوپہر سے پہلے شیشے کا گلاس اور چینی کی رکابی لا کر نیک بخت کے سامنے رکھ دی۔ وہ دونوں برتن ہاتھ میں لے کر اٹھی اور سیدھی بیٹے کی طرف بڑھی جو چولھانے کی اوٹ میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور دلہن کو دیکھ رہا تھا جو مسکرا مسکرا کر مہندی کے رنگ کو چمکانے کے لیے ہتھیلیوں کو گھی سے چپڑ رہی تھی۔

"یہ لے بہو اپنا گلاس اور اپنی رکابی۔ تیرا میرا حساب ختم۔" نیک بخت بیٹے کے بجائے بہو کی طرف بڑھی مگر بہو کے بجائے بیٹا اٹھا اور ماں کے ہاتھوں سے دونوں چیزیں چھین کر دیوار پر دے ماریں۔

نیک بخت چکرا کر بیٹھ گئی۔ پیر بخش جلدی سے چولھانے تک گیا مگر فوراً ہی پلٹ گیا۔ بعد میں نیک بخت بھی روتی بلبلاتی اس سے آملی۔ دونوں نے آپس میں کچھ طے کئے بغیر صندوق اور گٹھڑی میں اپنا سامان خوب بجا بجا کر رکھا۔ کھٹولے دیوار سے گھسیٹ کر صحن کے وسط تک لائے اور چیزیں اٹھا کر بیٹے اور بہو کے سامنے ہی گھر سے نکل گئے۔

بیٹے نے یہ تو کہا کہ "یہ تم ٹھیک بات نہیں کر رہے ہو" مگر اس نے ماں باپ کے تعاقب میں ایک قدم بھی نہ اُٹھایا اور ماں باپ لمبی گلی میں لوگوں کے ہجوم کو پیچھے چھوڑتے دور نکل گئے۔

پیر بخش اپنے کھیتوں میں جب خود ہی ہل چلاتا تھا تو اس نے کھیتوں کے شمال میں ڈھیری پر ایک کچا مکان ڈال لیا تھا۔ جب کھیت پکتے تو وہ نیک بخت سمیت یہاں آجاتا۔ دونوں کھیتوں کی رکھوالی کرتے اور کھلیان سے فصل اُٹھنے تک یہیں رہتے۔ حبیب احمد مدرسے میں پڑھتا تھا اور مدرسہ گاؤں میں تھا اس لئے وہ اسے دو تین مہینے کے لئے اس کی پھوپھی کے ہاں چھوڑ آتے۔ البتہ ہر ہفتے کی شام کو وہ "ڈھوک" پر آتا۔ اتوار اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارتا اور جب باجرے کی فصل سے چڑیاں اڑانے کے لئے اپنی ماں کے ساتھ! دیکھے ادیکھے "ہو ہو" پکارنے لگتا تو پیر بخش کہتا۔ "نہیں بیٹا۔ تو ایسا کہتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔" نیک بخت بھی کہتی "تو میرے ساتھ مت پکارا کر حبیبے، تو تو منشی بنے گا۔"

حبیب احمد منشی تو نہ بنا، البتہ دکان دار ضرور بن گیا۔ پہلے نمک مرچ اور گڑ شکر کی دکان کھولی۔ پھر کپڑا لے آیا اور ساتھ ہی شہر سے "ملک حبیب احمد ترازو" کا بورڈ بھی لکھوا لایا۔ تین چار سال کے اندر اس نے اتنا منافع کمایا کہ گاؤں کے رئیسوں میں گنا جانے لگا۔ پھر رئیسی کو مکمل کرنے کے لئے اس نے باپ کی

منت کرکے ہل ہل بکوادیئے اور زمینیں مزارعوں کے حوالے کر دیں۔ اس کے گھر میں میزیں کرسیاں آ گئیں۔ وہ ریڈیو کا بیٹری سیٹ بھی خرید لایا! اور اس کے مکان کی چھت پر لگے ہوئے ایریئل کے بانسوں کو قلعوں پہ لہراتے ہوئے شاہی پرچموں کی سی حیثیت حاصل ہو گئی۔

کھاٹ سے کرسی پہ منتقل ہو جانے کے بعد نیک بخت کو حبیب احمد کے لئے ایسے ایسے رشتے پیش کئے گئے کہ وہ لڑکی کے باپ کا نام سنتی تھی تو اسے چکر آ جاتے تھے۔ مگر پھر جب اپنی کرسیوں، میزوں اور پڑچھتیوں پر سجے ہوئے چینی کے برتنوں اور پیتل کے طشتوں کی طرف دیکھتی تھی اور ادھر سے ریڈیو بولتا تھا "ہم لاہور سے بول رہے ہیں" تو نیک بخت نفی میں سر ہلا کر نائنوں سے کہتی تھی "پاگل ہوئی ہو؟ وہاں سے چلی تھیں تو یہ بھی سوچ لیا ہوتا کہ کس کے گھر چلی ہو۔ میں تو کوہ قاف کی پریاں بھی اپنے جیبے پہ سے قربان کر دوں"

پھر اسے وہ پیغام بھی مل گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ گاؤں کے سب سے بڑے رئیس نے، جس کے کھیتوں میں پیر بخش نے بھی برے وقتوں میں ہل چلایا تھا، ایک روز خود آ کر اس سے بات کی اور جب پیر بخش نے نیک بخت کو بتایا تو اسے مارے خوشی کے غش سا آنے لگا۔ پھر بڑے دھوم دھڑکے سے یہ شادی ہوئی اور شادی کے چوتھے ہی دن نیک بخت سے

دلہن کے برتن ٹوٹ گئے۔

اپنی پرانی ڈھوک میں آ کر نیک بخت کوٹھے میں جھاڑ دیتی رہی اور روتی رہی اور کھانستی رہی۔ اور پیر بخش باہر بیٹھا اپنی داڑھی میں انگلیاں ڈالے اپنے قدموں میں بچھے ہوئے ان کھیتوں کو دیکھتا رہا جن کے ذرّے ذرّے کو اس کے ہل کی پھال بیسیوں مرتبہ الٹ چکی تھی۔ مگر اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دیس نکالے کے بعد کسی اجنبی دیس کی سرزمین کو پہلی بار دیکھ رہا ہے

کسانوں کی ڈھوکیں دور دور بکھری ہوئی تھیں مگر شام تک سب کو پتہ چل گیا کہ پیر بخش اور نیک بخت گاؤں سے اٹھ آئے ہیں۔ دوسرے دن سویرے سویرے ہی ان کے ہاں کسان عورتوں اور مردوں کا ہجوم لگ گیا سب کہتے کہ ٹھیک ہے۔ شادی کے بعد بیٹے کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور مائیں اپنے پورے پرانے بیٹے کے لیے بانہیں پھیلائے رہ جاتی ہیں۔ مگر شادی کے دسویں دن ہی وہ یہاں کیوں چلے آئے۔ ابھی تو دلہن کی ہتھیلیوں پر مہندی کا رنگ موجود ہوگا۔

پیر بخش کہتا رہا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ حکیم نے نیکاں کو کھلی ہوا میں رہنے کے لئے کہا ہے۔ کچھ دن یہاں رہیں گے۔ پھر چلے جائیں گے۔"

نیک بخت بھی پیر بخش کی نصیحت کے مطابق سب سے یہی کہتی رہی مگر جب ان کے دو مزارعے آئے اور انھوں نے پوچھا "ہمارے دیس کوئی

کام ہو تو بتائیے۔" تو نیک بخت ضبط نہ کر سکی۔ زور سے رو دی اور بین کے انداز میں بولی۔ "ہم سے کیوں پوچھتے ہو۔ جاؤ جیسے سے پوچھو جس نے ماں باپ کو بیچ کر بیوی خریدی ہے۔"

اور جب نیک بخت نے یہ کہہ کر اوپر دیکھا تو اس کے سامنے حبیب احمد کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "اماں۔ کچھ میری عزت کا تو خیال کر لو۔"

نیک بخت جو بیٹے کو دیکھ کر سناٹے میں آ گئی تھی۔ اس بات پر تڑپ اٹھی۔ "تیری عزت! اور کیا ہماری کوئی عزت نہیں ہے؟ کیا اپنی عمر بھر کی کمائی کی طرح ہم نے اپنی عزت بھی تیری شادی میں اڑا دی ہے؟ میں تجھے یہاں اپنی کوکھ میں نو مہینے اٹھائے پھری ہوں۔" نیک بخت نے زور زور سے ہاتھ مار کر اپنا پیٹ بجایا۔ "میں نے تجھے جنا ہے لڑکے۔ اور تو میرے سامنے اپنی عزت کا رونا رونے آیا ہے؟"

پیر بخش سامنے آ کر بولا۔ "پھر وہی ہو کا دینے لگیں؟"

"چل دے چل" نیک بخت اس کی طرف اپنا ہاتھ خنجر کی طرح بڑھا کر بولی اور روتی ہوئی کوٹھے کے اندر چلی گئی۔

"میں تو اماں۔ تم دونوں کو لینے آیا تھا" حبیب احمد نے جاتی ہوئی نیک بخت سے کہا۔ "مگر تم نے تو میرے منہ پر جوتے مارنے کے لئے یہاں پورا جلسہ بلا رکھا ہے۔"

"ابھی ہم مرے نہیں بیٹا" نیک بخت دروازے میں سے پکاری۔ ہم مر جائیں اور بیوی تمہیں اجازت دے دے تو ہماری لاشیں لے جانا۔ اس سے پہلے تو ہم نہیں آئیں گے۔ جا"

"تیرا تو دماغ چل گیا ہے۔" پیر بخش ملامت کرتا ہوا بیوی کی طرف بڑھا اور جب پلٹا تو حبیب احمد ڈھیری پر سے تیز تیز اترا جا رہا تھا۔

چند روز کے بعد نیک بخت بیمار ہوئی تو حبیب احمد بار بار گاؤں کے بڑے بڑے معتبروں اور ایک بار تو اپنے خسر کو ساتھ لے کر ڈھوک پر آیا کہ ماں باپ کو گاؤں واپس لے جائے، مگر نیک بخت برابر انکار کرتی رہی۔ پھر وہ ایک صبح کو مر گئی اور جب حبیب احمد اور دوسرے رشتہ دار اس کی میت کو اٹھا کر گاؤں لے جانے لگے تو پیر بخش بغیر کسی کے کہے چپ چاپ ان کے ساتھ ہو لیا۔

نیک بخت کا جنازہ گھر میں داخل ہوا تو اسے اپنی ہی ایک پرانی بات یاد آگئی۔ نیک بخت جب جوان تھی اور ذرا ذرا سی بات پر رو دینے میں بہت تیز تھی تو پیر بخش اس سے کہا کرتا تھا "وہ بس یہی کھل کر رونے والا معاملہ ایسا ہے جس میں عورتیں مردوں سے زیادہ آزاد ہیں۔ ورنہ رونے کو تو مردوں کا بھی جی چاہتا ہے۔" نیک بخت اس بات پر آنسوؤں میں مسکرانے لگتی۔ مگر اب تو وہ مر چکی تھی۔ اب تو اگر وہ سچ مچ رو بھی دیتا تو اس پر پیار سے مسکرانے والا

کوئی نہ تھا۔ پھر اپنی بیوی کی موت پر کبھی کوئی شوہر بر سرِعام رویا ہے کہ پیر بخش روتا۔ البتہ یہ دیکھ کر اسے سکون سا محسوس ہوا کہ چلو حبیب احمد تو رو رہا ہے۔ نیک بخت اگر ایک بیوی تھی تو ایک ماں بھی تو تھی۔ اس کی قبر کا ایک حصّہ تو ٹھنڈا رہے گا۔

کفن دفن کے بعد حبیب احمد اور وہ صحن کے ایک طرف جہاں بیٹے کی شادی کے بعد پیر بخش اور نیک بخت کے کھٹولے بچھتے تھے، چٹائیاں پھیلا کر بیٹھ گئے اور فاتحہ خوانوں کی مدارات میں لگ گئے۔ شام کو جب کسی رشتہ دار کے ہاں سے کھانا آیا تو پیر بخش یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لئے نیک بخت کی موت تک کو بھول گیا کہ اس کا بیٹا کونہ اٹھا کر اس کے ہاتھ دھلا رہا ہے۔

عشا کی اذان کے بعد جب ماتم کرنے والی عورتیں چلی گئیں اور پیر بخش اپنے بیٹے اور بہو کے پاس اکیلا رہ گیا تو حبیب احمد اس کے پاس آیا۔ کچھ دیر اس کے پاس چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر رونے لگا اور اس کے گھٹنے پکڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کر دو بابا۔ اماں نے مجھے بتیس دھاریں نہیں بخشیں مگر قیامت کے دن میں اس سے بخشوا لوں گا۔ بس تم من جاؤ تو اماں بھی من جائے گی۔"

یکا یک پورے دن کا رکا ہوا غبار پیر بخش کی آنکھوں میں سے ایک طوفان کی طرح پھٹ پڑا۔ حبیب احمد بھی اس کے ایک گھٹنے پہ ہاتھ رکھے روتا رہا۔ پھر بہت زیادہ رونے کی وجہ سے پیر بخش کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے تو

حبیب احمد پکارا "ادھر آ خاتون۔ بابا کے تلوے مل۔"

نیک بخت کی موت کے بعد خاتون پہلی بار پیر بخش کے سامنے آئی اور پیر بخش نے دیکھا کہ وہ بھی رو رہی ہے۔ پھر وہ اپنے سر کی چادر کا گولا سا بنا کر پیر بخش کے تلوے اس زور سے رگڑنے لگی کہ اس کے کھلے بالوں نے بکھر کر اس کے آدھے چہرے کو ڈھک لیا۔ ادھر حبیب احمد بھی اسی تیزی سے باپ کی ہتھیلیاں مل رہا تھا۔ یکایک پیر بخش کو محسوس ہوا کہ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین باپ ہے۔ اس نے سکون کی ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اگرچہ قبر میں نیک بخت کی یہ پہلی رات تھی۔ مگر پیر بخش بیٹے کی شادی کے بعد پہلی بار آسودگی کی نیند سویا۔

موت کے بعد پہلی جمعرات تک حبیب احمد نے دکان بند رکھی۔ وہ دن بھر گھر میں بیٹھا قرآن شریف پڑھتا رہتا اور باپ کو پانی پینے کے لئے بھی نہ اٹھنے دیتا۔ چارپائی پر ہی وہ باپ کے ہاتھ دھلاتا۔ پھر خاتون کھانا اٹھا لاتی اور ایک بار ایسا بھی ہوا کہ مکھیاں اڑانے کے لئے وہ اپنی چادر کے پتو سے پنکھا کرنے لگی۔ صحن کے ان گوشوں کو دیکھ کر پیر بخش کا کئی بار رونے کو جی چاہا جہاں نیک بخت نے چرخے کاتے اور اپلے تھوپے تھے، مگر بیٹے اور بہو کے سلوک نے اس کے آنسو جذب کر لئے تھے۔ وہ پرانی یادوں پر بس ایک آدھ آہ بھرنے پر اکتفا کرتا تھا اور پھر بیٹے یا بہو سے باتیں کرنے لگتا تھا وہ پڑھے سے ذرا ہٹ کر بیٹھ بیٹی۔

آنچ سے رنگ جل جاتا ہے"۔ "جمعے کو دکان ضرور کھول لینا بیٹے تجھے نقصان ہو رہا ہے۔"

حبیب احمد نے بڑے ٹھاٹھ کی جمعرات کی۔ آدھا گاؤں کھانا کھانے آیا۔ حافظوں نے اٹھارہ ختم مرحومہ کی روح کو بخشے جن میں دو ختم حبیب احمد کے اور دس پارے خاتون کے بھی شامل تھے۔ دور دور سے منگتے آئے اور پیٹ بھرنے کے بعد کھانے سے جھولیاں بھی بھر کر لے گئے۔ پیر بخش صحن کے ایک طرف کرسی پر بیٹھا حقہ پیتا رہا اور نمایاں غرور کے ساتھ سارے کام کی نگرانی کرتا رہا اور ساتھ ہی سوچتا رہا۔ "کاش اس وقت نیک بخت ہوتی تو بے چاری کتنی خوش ہوتی۔"

صبح کو حبیب احمد دکان پر چلا گیا تو پیر بخش پر پہلی بار اداسی کا دورہ پڑا نیک بخت اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگی۔ اور صحن میں اِدھر سے اُدھر اور یہاں سے وہاں ٹہلنے لگی۔ پیر بخش گھبرا کر گلی میں آ گیا اور موڑ پہ بیٹھا لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ بڑی بوڑھیاں اس کے پاس سے گزریں تو چپ چاپ بیٹھے ہوئے پیر بخش کو دیکھ کر رونے بیٹھ گئیں۔ اور نیک بخت کی خوبیاں گنانے لگیں۔ وہ پھر اندر چلا آیا۔ بہو چولھے میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ پیڑھی قریب لا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ "بے چاری نیک بخت بھی اسی جگہ بیٹھ کر کھانا پکاتی تھی جہاں تم بیٹھی ہو۔"

خاتون نے گھبرا کر پیر بخش کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا مگر پیر بخش ماضی کی سیر میں مگن تھا۔ بولا: "نیک بخت سے پہلے میری اماں نے اسی جگہ بیٹھ کر چالیس سال تک کھانا پکایا ہے۔ اور میں یہیں بیٹھ کر جہاں اب بیٹھا ہوں، ضد کرتا تھا کہ میرے حصے کے پراٹھے پر میری مٹھی برابر گھی ڈالو ورنہ میں اسے کتے کو کھلا دوں گا۔" پیر بخش بچوں کی طرح ہنسنے لگا اور اسے اپنی آواز اجنبی سی لگی کیونکہ بیٹے کی شادی کے بعد اس نے پہلی بار اپنے آپ کو ہنستا سنا تھا۔ "گھی مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔" اس نے اپنی ہنسی کا جواز پیش کرنا چاہا۔

"مگر بابا، آج کل تو گھی بہت مہنگا ہے۔" خاتون بولی۔ "آج کل تو پورے برابر گھی سے پراٹھے پکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں بیٹی"۔ پیر بخش نے خاتون کے لہجے میں کھٹکتی ہوئی سوئی کی چبھن محسوس کر لی تھی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اب تو میں کچا گھی کھاؤں تو بیمار ہو جاؤں۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ زندگی کتنی جلدی جلدی کٹ جاتی ہے پرسوں اس چولھے کے پاس میری اماں بیٹھی تھی، کل نیک بخت بیٹھی تھی آج تم بیٹھی ہو۔"

خاتون نے ایک بار پھر گھبرا کر پیر بخش کو دیکھا اور بولی "تو یوں کہو نا بابا کہ اب تمہیں میری موت کا انتظار ہے۔"

پیر بخش کے سینے پر جیسے خاتون نے گھونسا دے مارا۔ وہ "ہائیں" کہہ کر رہ گیا۔ پھر مار کھائے بچے کی طرح چپکے سے اٹھا۔ چولھانے کی حد بندی کی اوٹ میں کھڑا سامنے کی دیوار کو یوں دیکھنے لگا جیسے بہت دور دیکھ رہا ہے۔ اس نے نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا اور اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں، ضبط کی اس کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور خاتون کے سامنے اتنے بڑے راز کے فاش ہونے کے ڈر سے وہ پھر گلی میں آ گیا جب حبیب احمد دکان بند کر کے دوپہر کا کھانا کھانے گھر کی طرف آیا تو پیر بخش گلی کے موڑ پر بیٹھا، چٹکی میں تنکا لئے، مٹی پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

حبیب احمد کے ساتھ وہ گھر میں آیا اور جب حسب معمول اس کے ہاتھ دھلائے گئے اور خاتون نے اسی طرح کھانا لا کر اس کے سامنے رکھا تو اس کی ساری کوفت دور ہو گئی کھانے کے بعد وہ وہیں چارپائی پر بیٹھا حقہ پینے لگا حبیب احمد واپس دکان پر چلا گیا تھا اور خاتون چولھانے میں بیٹھی برتن دھو رہی تھی جب وہ پکارا "بیٹی، حقے کے لئے اُپلے کی آگ تو اٹھا لا۔ ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔"

"میں برتن دھو رہی ہوں" خاتون بولی۔

"چمٹے سے اٹھا لا" پیر بخش نے کہا۔

برتن زور سے بجے جیسے ایک دوسرے پر دے مارے گئے ہوں۔ پھر خاتون چمٹے میں اُپلے کی آگ اٹھائے، چولھانے میں سے نکلی۔ مگر اس طرح نکلی

کر پیر بخش آگ کے بجائے خاتون کے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔

خاتون نے آگ کو چمٹے سمیت پیر بخش کے جوتوں کے پاس پھینک دیا اور واپس چولھانے میں گئی تو ایک بار پھر برتن زور سے بجے۔

پیر بخش حقہ پینا بھول گیا۔ آگ وہیں پڑے پڑے راکھ ہو گئی۔

شام کو جب حبیب احمد دکان بند کر کے گھر واپس آیا تو پیر بخش گلی کے موڑ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ "دیکھ حبیب"۔ اس نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا اور دن کے دونوں واقعات سنا دیئے۔ حبیب احمد چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ پھر ہاتھ چھڑا کر تیزی سے گھر میں داخل ہو گیا۔

پیر بخش خاصی دیر تک وہیں گلی میں کھڑا رہا۔ مدتوں کے بعد اسے اپنی بہن یاد آئی کہ زندہ ہوتی تو یہاں سے سیدھا اس کے پاس چلا جاتا۔ بیٹا بھی اندر جا کر اسے بھول گیا تھا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ بیٹے کو آزمائے۔ یہیں بیٹھ جائے اور اگر بیٹا اسے بلانے نہیں آتا تو رات بھر یہیں بیٹھا رہے۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور سامنے دیکھا تو اپنے مکان کی چھت پر ایریل کے دونوں بانس اندھیرے آسمان کے پس منظر میں اسے یوں پھیلے پھیلے نظر آنے لگے جیسے خاتون اور حبیب احمد کھڑے اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ روٹھے ہوئے بچے کی طرح سمٹ کر دیوار میں گھس جانا چاہتا تھا کہ اچانک گلی کے ایک طرف سے اسے دو آدمی باتیں کرتے ہوئے سنائی دیئے۔ وہ

ادھر ہی آرہے تھے۔ پیر بخش گھبرا کر اٹھا اور تیزی سے گھر کے صحن میں داخل ہوگیا۔ اس وقت حبیب احمد دیوار کے ساتھ سائے کی طرح لگا کھڑا تھا اور خاتون چولھے میں جلتی ہوئی آگ کو گھورے جا رہی تھی۔

پیر بخش کو ایسا لگا کہ اس نے گھر کے باغیچے کے سارے پھول نوچ کر پھینک دیئے ہیں اور ہر طرف پودوں کے ننگے خنجر اُگے ہوئے ہیں۔ سناٹے کو توڑنے کے لیے وہ اپنی چارپائی کو گھسیٹتا اس گوشے میں لے آیا جہاں حبیب احمد کی شادی کے بعد تک بخت اور اس کے کھونٹے رکھے رہتے تھے اور جہاں فاتحہ خوانوں کے لیے چٹائی بچھی تھی۔

اس رات کھانا بھی کسی نے نہ کھایا۔ پیر بخش قریب قریب ساری رات جاگتا رہا۔ کبھی غنودگی بھی چھائی تو اس کے کان جاگتے رہے۔ وہ بار بار چونک کر یوں سر اٹھا لیتا تھا جیسے چولھانے سے پرے اس نے کسی کی ہنسی کی آواز سنی ہے۔ شروع رات میں خاتون کی چند سسکیوں کی آواز ضرور آئی تھی مگر اس کے بعد ایسی خاموشی چھائی کہ دیر تک کسی آواز کا انتظار کرتے کرتے پیر بخش کو خاموشی سے خوف آنے لگا تھا اور اس نے کھانس کھنکار کر اپنی ڈھارس بندھائی کہ ابھی قیامت نہیں آئی۔ ایک بار اس کا یہ بھی جی چاہا کہ چپکے سے کھاٹ سر پہ رکھے اور ہمیشہ کے لیے کھیتوں میں جا بسے مگر اب کھیت بھی تو حبیب احمد کے تھے۔ اور پھر کہیں نکل جانے سے پہلے

وہ حبیب احمد اور خاتون کو ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کرتے بھی سنتا چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بیٹے نے باپ کی شکایت کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور حد یہ ہے کہ اس سے کھانے تک کو نہیں پوچھا تھا، مگر آخر حبیب احمد اور خاتون میاں بیوی تھے اور جب میاں بیوی خفا ہوتے ہیں تو انہیں اپنے سوا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ پیر بخش کی بے چینی اس وقت انتہا کو پہنچ جاتی تھی جب اُسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ سناٹا اسی نے پیدا کیا ہے۔

ایک بار نیک بخت اس سے روٹھ گئی تھی تو اسے زندگی سے کتنی نفرت ہو گئی تھی۔ اس روز اس نے نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ دوپہر تک وہ گلیوں میں بے مقصد گھومتا پھرا تھا۔ پھر وہ بکریوں کے لئے صحن میں اُگی ہوئی بیری کی شاخیں کاٹ رہا تھا کہ اس کی ہتھیلی میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ اور نیک بخت کو جو دیوار سے لگی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی، نہ جانے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ پیر بخش کے کانٹا چبھ گیا ہے۔ وہ تو اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ بہرحال وہ ایک دم اٹھی تھی۔ اندر سے سوئی لے کر اس کی طرف لپکی تھی۔ پیر بخش بھی یہ دیکھ کر نیچے اُتر آیا تھا اور نیک بخت نے اس کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھ میں لے کر ٹوٹا ہوا کانٹا نکالا تھا اور بولی تھی "جب تجھے کانٹا چبھنے لگے تو مجھے پکار لیا کر کہ میرے ہوتے تیرے قسمت کا کانٹا بھی میرے حصے کا کانٹا ہے"۔ اس کے بعد دونوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ ایک دوسرے

سے کبھی نہیں روٹھیں گے۔ پیر بخش کو یہ واقعہ یاد آیا تو اُسے ایسا لگا جیسے وہ خود بیری کا درخت ہے جس میں پتوں کی جگہہ بھی کانٹے نکلے ہوئے ہیں ۔ اور اُس نے اپنے بیٹے اور بہو کی ہتھیلیاں چھلنی چھلنی کر ڈالی ہیں۔

گھبرا کر اُس نے اپنی باہوں کو ہاتھوں سے رگڑا اور چوکھانے کی پرلی طرف سے کوئی آواز سننے کے لیے سر اُٹھا لیا۔ مرغے بانگ دینے لگے تھے اور تاروں بھرے آسمان کی سیاہی پھیکی پڑنے لگی تھی ۔

مسجد سے اذان کی آواز آئی ۔ وہ کلمہ پڑھ کر اُٹھا اور یکایک اسے محسوس ہوا کہ اس کی تو آنکھیں جل رہی ہیں ۔ اور سر گھوم رہا ہے اور دل ٹخنوں اور پیٹ اور کنپٹیوں تک میں زور زور سے بج رہا ہے ۔ کوزہ چوکھانے کی حد بندی پر رکھا تھا ۔ وہ پنجوں کے بل چلتا وہاں تک گیا۔ اور کوزہ اُٹھایا تو حبیب احمد کی آواز آئی ۔ "اُٹھ گئے بابا؟"

پیر بخش جیسے اچانک پکڑا گیا ۔ گھبرا کر بولا "ہاں بیٹا"۔

"کوزے میں پانی ہے کہ بھر دوں ؟" اس نے پوچھا۔

پیر بخش نے کوزہ چھلکا کر کہا "ہے"

پیر بخش پلٹا تو حبیب احمد نے خاتون سے کہا "سنتی ہو، صبح ہو گئی"

"میں تو کب کی جاگ رہی ہوں ۔" وہ بولی

"تو کیا میں سو رہا تھا؟" حبیب احمد بولا ۔

پھر جانے حبیب احمد نے خاتون کے گدگدی کی یا کیا ہوا، خاتون دُبلے دبلے ہنسنے لگی اور ایک بار حبیب احمد بھی ذرا سا ہنسا۔

پیر بخش کو میاں بیوی کی اس بات چیت اور اسی ہنسی مذاق کا انتظار تھا مگر اچانک جیسے اس کی بے خبری میں اس کے سینے کے اندر کچھ ٹوٹا اور اسے اپنے بیٹے پر غصّہ آنے لگا جس نے باپ کو طاق پر رکھ کر بیوی سے صلح کر لی تھی۔ مگر کیا دونوں کی لڑائی بھی ہوئی تھی؟ کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کا بیٹا اُس کی خاطر اپنی بیوی سے لڑ بیٹھے؟

حبیب احمد اور خاتون باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ آخر وہ اس وقت کیا باتیں کر رہے تھے اور کیوں ہنس رہے تھے! وضو کرتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کی جلد کا ڈھیلا ڈھالا پن محسوس کیا اور اسے یقین سا ہونے لگا کہ اس کی بہو اور بیٹا اسی کے پاس کے بڑھاپے پر اور اُس کے بڑھاپے کی بے بسی پر ہنس رہے ہیں۔ یہ سوچتے ہی کوزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور ٹوٹ گیا۔ حبیب احمد اور خاتون پلنگوں پر سے کود کر اُترے اور ٹوٹے ہوئے کوزے کے پاس ایک مجرم کی طرح بیٹھے ہوئے پیر بخش کو دیکھ کر واپس چلے گئے۔

اچھا ہوا کہ خاتون خاموش رہی، پیر بخش نے سوچا، یہ تو بہت اچھا ہوا مگر حبیب احمد کی خاموشی کا تو یہ مطلب تھا کہ اسے کوزے کا ٹوٹنا بُرا

لگاہے۔ کوزہ جو آج بھی چار پیسے میں آتا ہے اور جو نیک بخت نے اچھے وقتوں میں ایک لپ باجرہ دے کر خریدا تھا۔

ابھی ایک پاؤں دھونا باقی تھا مگر پیر بخش نے نہ دوسرا کوزہ مانگنے کی جرأت کی اور نہ گھڑے میں سے چلو بھر پانی کٹورے میں نکالنے کا حوصلہ کیا۔ ایک پاؤں پہ مسح کر کے اس نے نماز پڑھی اور جب پڑھ چکا تو حیران رہ گیا کہ اسے نہ تو نیت کرنا یاد تھا اور نہ رکوع اور سجدے۔ اور وہ ایک مشین کی طرح نماز کے بعد کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔

حبیب احمد کے دکان جانے کا وقت قریب آ رہا تھا مگر اب تک وہ باپ کے پاس کل شام کی شکایت کا جواب لے کر نہ آیا تھا۔ پیر بخش تسبیح پہ سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کر رہا تھا اور ایک بار جب سویں منکے تک پہنچنے والا تھا تو اس پر انکشاف سا ہوا کہ وہ حبیب حبیب کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ تسبیح کو جیب میں رکھ کر وہ باہر نکل گیا کہ شاید یہاں گھر میں حبیب احمد اپنی بیوی کے ڈر سے بات نہ کر رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد حبیب احمد دکان جانے کے لئے باہر آیا۔ باپ کو دیکھا اور بولا "بابا"

"بیٹا" پیر بخش نہایت شوق سے اس کی طرف بڑھا۔

"آج تم نے حقہ کیوں نہیں پیا بابا؟" حبیب احمد بولا۔

پیر بخش اس سوال کے جواب میں کوئی ایسی بات کہنا چاہتا تھا جس

سے شکایت کا کوئی پہلو نکلے اور وہ اپنے کل شام کے گلے کا جواب حاصل کر سکے "وہ تمہیں کیسے خیال آیا میرے حقہ پینے کا؟" پیر بخش نے کہا۔ مگر بعد از وقت کہا کیونکہ حبیب احمد تو اس سے پہلے ہی شاید حقہ تیار کرنے کے لئے واپس گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

پیر بخش بھی اندر چلا آیا۔ اس وقت حبیب احمد چولھانے میں بیٹھا چمٹے کی مدد سے حقے پر آگ جما رہا تھا اور خاتون کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھے اور اٹھے ہوئے بازوؤں میں اپنا سر تھامے یوں بیٹھی تھی جیسے جو کچھ اس کا شوہر کر رہا ہے۔ اس سے خود اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

پیر بخش کو ایک ترکیب سوجھی۔ بولا "بیٹا میرے کپڑے بڑے میلے ہو رہے ہیں۔ دوپہر کو ایک بٹی صابن لیتے آنا۔ میں کنوئیں پر جا کر دھو لاؤں گا"۔

"نہیں، بابا"۔ حبیب احمد چونک کر بولا "کپڑے گھر میں دھل جائیں گے"

پیر بخش کا مسکرانے کو جی چاہا۔ اس نے خاتون کو دیکھا جو اسی حالت میں بیٹھی چولھے کو گھور رہی تھی۔ وہ اسے ایک چھوٹی سی شرمیلی سی لڑکی لگی۔ حبیب احمد نے اُسے سمجھا دیا ہو گا۔

پیر بخش نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا اس لیے سکون سے بیٹھا حقہ پیتا رہا۔ حبیب احمد دکان پر جا چکا تھا۔ اور خاتون چولھانے میں بیٹھی دوپہر کا کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ پیر بخش اپنے کوٹھے میں گیا۔ بستر میں سے

کھیس نکال کر تہ بند کے طور سے باندھا اور چولھانے میں آ کر اپنے میلے کپڑے خاتون کے سامنے رکھ دیئے۔

خاتون ایک دم بولی "میں انہیں کیا کروں؟"

"دھونے ہیں" پیر بخش بولا "ابھی ابھی حبیب نے کہا تھا نا کہ گھر میں دھل جائیں گے۔ سو گھر میں حبیب تھوڑی دھوئے گا۔ تمہی دھوؤ گی"

"مجھ سے نہیں دھلتے" خاتون نے ایک کپڑے کو مرے ہوئے چوہے کی طرح چٹکی سے اٹھا کر چھوڑ دیا "کبھی دھوئے ہوں تو دھلیں"

"تو پھر کون دھوئے؟" پیر بخش نے پہلی بار آواز میں سختی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"تم دھوؤ، حبیب دھوئے۔ کوئی دھوئے۔ بس مجھ سے نہیں دھلتے"

اس نے کپڑوں کو پیر بخش کی طرف کھسکا دیا اور ہنڈیا میں چمچہ چلانے لگی۔

پیر بخش کو غصہ آ گیا۔ اگر حبیب احمد صاف طور سے کہہ دیتا کہ گھر میں دھو لینا تو دوسری بات تھی۔ مگر گھر میں دھل جائیں گے کا مطلب تو یہ تھا کہ خاتون دھو دے گی اس معاملے میں اسے اپنے بیٹے کی حمایت کا یقین سا تھا اس لئے بولا "تم سے نہیں دھلتے تو مجھ سے بھی نہیں دھلتے"

"مجھ سے تو نہیں دھلتے" خاتون نفرت سے بولی۔

"میں ہما کے حبیب کو تباہ دوں گا" پیر بخش نے دھمکی دی۔

اور خاتون نے یکایک کھڑے ہو کر ہاتھ کولھوں پر رکھ لیئے اور کڑک کر کہا "تو پھر جاؤ ابھی جا کر بتا دو۔ میں جانتی ہوں تمہارے بیٹے کو۔ زیادہ زبان نہ لڑاؤ ورنہ میرا ابا سارے گاؤں کے سامنے تم دونوں کے جوتے لگوائے گا"

"جوتے لگوائے گا؟" پیر بخش نے یہ الفاظ یوں دہرائے جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اُس نے یہی الفاظ سُنے ہیں۔ "میں ساٹھ سال کا ہو رہا ہوں لڑکی اور میں نے جوتے دوتے کی بات کسی سے نہیں سُنی اور نہ سن سکتا ہوں۔ تیرا ابا تو جب آئے گا۔ آئے گا۔ میں اس سے پہلے اپنے بیٹے سے تجھے جوتیاں لگواؤں گا۔ بدذات کہیں کی"

ایک جھٹکے سے خاتون جھکی اور دھودھا سے بھری ہوئی صحنک اُٹھا کر پیر بخش پر دے ماری۔ پیر بخش ایک طرف ہٹ گیا اور صحنک کی ٹھیکریاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ پھر خاتون چیخ چیخ کر رونے لگی اور روتے ہوئے گالیوں کا ایک طومار باندھ دیا۔ پھر وہ وہیں ڈھیر ہو کر پاؤں پٹخنے اور ہچکیاں لینے لگی۔

پیر بخش نے میلے کپڑے اٹھائے۔ اپنے کوٹھے میں آ کر اُنہیں پہنا اور اس تیزی سے گھر میں سے نکلا جیسے کوئی اس کے سامنے آیا تو اُسے لتاڑتا ہوا گزر جائے گا۔ وہ اسی تیزی سے حبیب احمد کی دکان میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں گاہکوں کا ہجوم تھا اس لیئے پہلے تو دروازے

میں کھڑا ہانپتا رہا اور حبیب احمد کو دیکھتا رہا جو کپڑا ناپنے میں مصروف تھا۔ پھر وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔

آہستہ آہستہ اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھلنے لگیں۔ اس کا اکڑا اکڑا جبڑا ڈھیلا ہو گیا۔ اس کے اٹھے ہوئے کندھے گر گئے اور جب کافی دیر کے بعد بھیڑ چھٹ گئی اور حبیب احمد نے اس کی طرف دیکھا تو بولا "ارے بابا۔ تم بھی بیٹھے ہو؟ کب آئے ہو؟ کیا بات ہے؟ کیسے آئے؟"

پیر بخش جواب میں ایک پل تک بیٹے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "کچھ نہیں بیٹا۔ بس تمہیں دیکھنے آنکلا تھا کہ تم دکان میں بیٹھے کیسے لگتے ہو۔"

حبیب احمد یوں مسکرایا جیسے شرما رہا ہے۔ پھر وہ حساب کے رجسٹر پہ جھک کر کچھ لکھنے لگا۔

(فروری ۱۹۶۱ء)

سلطان

دادا کے بائیں پنجے میں سلطان کی کھوپڑی تھی اور دائیں میں لاٹھی جو میٹری کے پکے فرش پہ ٹھک ٹھک بجے جارہی تھی۔

سلطان ذرا سا رکا تو دادا جلدی سے بولنے لگا۔ "ہے بابو جی - اندھے فقیر کو ـــــ"

"نہیں نہیں دادا" سلطان بولا "بابو نہیں ہے۔ مداری کا تماشا ہو رہا ہے۔"

"تیرے مداری کی ـــــ" گالی کو مکمل کرنے سے پہلے ہی دادا پر کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ سلطان کے سر پہ رکھے ہوئے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر کھانسی کے ایک لمبے چکر میں ڈوب گیا۔

جب تک دادا کی سانس معمول پہ آئی، سلطان مداری کی ٹوکری کے نیچے رکھے ہوئے چیتھڑوں کو سفید براق رنگ کے دو موٹے موٹے

کبوتروں میں بدلتا دیکھ چکا تھا۔

دادا نے اپنا بایاں بازو ہوا میں پھیلا کر پوچھا۔ "کہاں گیا تو؟"

سُلطان نے فوراً اپنا سر دادا کے پنجے میں تھما دیا اور دونوں پٹری پر چلنے لگے۔

ایک جگہ دادا کی لاٹھی بجلی کے کھمبے سے ٹکرائی تو کھمبا بج اُٹھا اور سلطان بولا۔ "دادا۔ سُنا، کھمبا کیسا بولا؟"

"ہاں" دادا رک گیا اور کھمبے کو ایک بار پھر بجانے کی کوشش کی مگر نشانہ چوک گیا۔ "کھمبے بولتے ہیں۔ لے ذرا سا بجا لے۔"

سلطان نے دادا کی لاٹھی کھمبے پر ماری اور دادا بولا۔ "دیکھا؟ جب میں تمہاری طرح چھوٹا سا تھا تو دیر دیر تک کھمبوں پہ کان رکھے کھڑا رہتا تھا۔ ان دنوں کھمبوں میں میمیں انگریزی بولتی تھیں۔" پھر دادا نے میموں کی نقل کی۔ "یو گڈ۔ یو بیڈ۔"

"میمیں بولتی تھیں کھمبوں میں؟" سلطان حیران رہ گیا۔ "آج کل کون بولتا ہے دادا؟" پھر ایک دم سلطان کا لہجہ بدلا اور اس نے سرگوشی میں دادا سے کہا۔ "دو بابو آ رہے ہیں دادا۔"

دادا جلدی جلدی بولنے لگا۔ "ہے بابو جی۔ اندھے فقیر کو راہِ مولا ایک روٹی کے پیسے دیتے جاؤ۔ اللہ تمھیں ترقیاں دے۔ اللہ تمھیں

بیٹے اور پوتے دے۔"

ایک بابو قہقہہ مار کر بولا "یہ بڈھا تو خاندانی منصوبہ بندی کیخلاف پروپگینڈا کرتا پھرتا ہے۔" پھر دونوں زور زور سے ہنستے ہوئے گذر گئے "چلے گئے!" سلطان نے آہستہ سے کہا پھر ذرا سا رک کر اس نے بابوؤں کو گالی دے دی۔

دادا نے اپنے پنجے کو سلطان کی کھوپڑی پر دبایا۔ "پھر وہی بک بک کل کیا کہا تھا میں نے؟ کبھی کسی نے سن لیا تو اِدھر کا منہ اُدھر لگا دے گا۔"

سلطان چپ چاپ دادا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔ "میرے سر پہ جہاں تمھارا انگوٹھا ہے نا دادا۔ وہاں ذرا سا کھجا دو۔"

دادا نے اپنا انگوٹھا سلطان کی کنپٹی پہ زور سے رگڑا۔

"سلطان۔" خاصی دیر کے بعد دادا بولا "کیا بات ہے آج تو تم کہیں رکتے ہی نہیں۔ آج بابو لوگ کہاں چلے گئے؟"

"مر گئے" سلطان نے جواب دیا۔ پھر یکایک رک گیا اور بولا۔

"آج کون سا دن ہے دادا؟"

"میں کیا جانوں بیٹا" دادا بولا "تم دن یاد رکھا کرو نا۔ میرے لئے تو دن رات دونوں برابر ہیں" دادا نے ذرا سا رک کر سوچا۔ پھر بولا۔ "پرسوں تم مجھے نیلا گنبد کی مسجد میں لے گئے تھے نا؟ پرسوں جمعہ تھا۔ اس

حساب سے تو آج اتوار ہے۔ بیڑا غرق ہو اس اتوار کا۔ آج تو بابو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے بیوی بچوں سے کھیل رہے ہوں گے۔"

سلطان یوں دم بخود کھڑا رہ گیا جیسے کوئی زبردست حادثہ ہو گیا ہے اچانک ٹن کی آواز آئی۔ کسی راہ چلتے نے سلطان کے ہاتھ کے کٹورے میں ایک پیسہ ڈال دیا تھا۔

"کچھ ملا؟ کیا ملا؟" دادا نے پوچھا۔

"ایک پیسہ ہے"۔ سلطان بولا۔ "چھوٹے والا۔ نئے والا۔"

دادا نے اپنا پنجہ سلطان کے سر پہ گھمایا۔ "جا کوئی چیز لے کر کھا لے جا۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔"

"ایک پیسے کا تو کوئی کچھ نہیں دیتا دادا" سلطان بولا۔ "دو تین ہو گئے تو گنڈیری کھاؤں گا۔"

دادا نے سلطان کے سر پہ سے ہاتھ اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ "لے یہ دو نئے پیسے کل کے بچے رکھے ہیں۔ کوئی چیز کھا لے۔ تو نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ بچوں کو تو بڑی بھوک لگتی ہے۔ جا۔"

سلطان نے پیسے لے لیے تو دادا بولا۔ "جلدی سے آ جا۔ اچھا میں یہیں کھڑا ہوں۔ کہاں کھڑا ہوں میں؟"

"ذرا سا بائیں کو ہو جا دادا"۔ سلطان نے دادا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

وہ کھمبے کے ساتھ لگ جا۔"

دادا کھمبے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ پھر وہ کھمبے پہ کان رکھ کر جیسے کچھ سننے لگا اور مسکرانے لگا۔ یکایک وہ چونک سا اٹھا اور سلطان کو پکارنے لگا "سلطان۔ اے سلطان۔" پھر وہ اُسے گالیاں دینے لگا "او حرامزادے سلطان۔ تو کہاں جا کر مر گیا؟" کوئی جواب نہ پا کر وہ اِدھر اُدھر گھوم کر بولا "اے بھئی خدا کے بندو۔ میرا چھوٹا سا پوتا اِدھر کہیں سے بیسے دو بیسے کی کوئی چیز لینے گیا ہے۔ سلطان نام ہے کہیں ٹانگے موٹر کے نیچے تو نہیں آ گیا بدنصیب کی اولاد۔" پھر وہ چلا دیا۔ "او سلطان۔"

"آیا دادا" دور سے سلطان کی آواز آئی۔ مگر زور سے چیخنے کی وجہ سے دادا کے کھانسی چھوٹ گئی۔

دادا کی سانس معمول پہ آنے لگی تو اس نے پلٹ کر جیسے کھمبے سے پوچھا "کہاں مر گیا تھا تو؟"

سلطان نے دادا کا بایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پہ رکھ لیا۔ "مداری تماشا دکھا رہا تھا۔ پیٹ سے گولے نکال رہا تھا۔"

دادا نے اپنے پنجے کو سلطان کی کھوپڑی پہ یوں دبایا جیسے اسے اوپر اٹھا لے گا۔ "چل گھر چل۔۔ ہاں میں تجھے مداری کا تماشہ دکھاؤں

حرام زادے، یہ نہیں سوچا کہ میں اندھا ہوں جو یہاں رستے میں کھڑا ہوں۔"
سلطان چُپ چاپ چلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد دادا نے نرمی سے پوچھا۔ "وہ کیا کھایا؟"
"گنڈیریاں" سلطان بولا۔
"ارے بدبخت گنڈیریاں تو پانی ہوتی ہیں۔" دادا پھر غصے ہونے لگا۔ "وہ چنے کھا لیتا تو دوپہر تک کا سہارا تو ہو جاتا۔"
سلطان چپ چاپ چلتا رہا۔
"کٹورا ہاتھ میں لٹکا تو نہیں رکھا؟" دادا نے پوچھا۔
"نہیں دادا" سلطان بولا۔
"ہاں" دادا نے نرمی سے نصیحت کی "وہ اٹھائے رکھا کرو۔ لٹکا رہے تو لوگ سمجھتے ہیں یہ بھکاری نہیں ہیں۔ سودا لینے چلے ہیں۔"
سلطان ہنسنے لگا۔ "وہ ایک بار میں کٹورے میں تیل لینے جا رہا تھا تو ایک بابو نے اس میں دونی ڈال دی تھی۔ یاد ہے دادا؟"
"ہاں" دادا بولا۔ "پر ایسا کم ہوتا ہے ایسے بابو کم ہوتے ہیں۔"
"دادا" سلطان نے کہا۔ "انگوٹھے والی جگہ کو ایک بار پھر کھجا دے۔"
دادا نے سلطان کی کنپٹی پر انگوٹھا زور سے رگڑا اور بولا۔ "آج واپس جا کر میں تیری بیٹی سے کہوں گا کہ میرے بچے کے سر سے جوئیں چن لے۔

تم بھی اس کا کوئی کام کر دینا۔ بالٹی بھر لانا نل سے ۔ اچھا؟"

"اچھا" سلطان نے جواب دیا۔

گھر واپس آ کر جب سلطان، دادا کو کھٹولے کے پاس لاتا تو کہتا۔ "لے دادا بیٹھ جا۔" دادا لاٹھی کو کھٹولے کے پائے سے لگا دیتا اور سلطان کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر کھٹولے پر بیٹھ جاتا۔ سر پر سے دادا کا ہاتھ اٹھتے ہی سلطان کو یوں محسوس ہوتا جیسے ایک دم وہ ہلکا پھلکا ہو گیا ہے اور اس کے پاؤں میں لوہے کے گولوں کی جگہ ربڑ کے پہیے بندھ گئے ہیں۔ وہ چپکے سے چھپریا میں سے نکل آتا۔ پھر خالہ زیبو کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلتا اور بنگلوں سے گھرے ہوئے میدان میں پہنچ جاتا جہاں امیروں کے بچے کرکٹ کھیلتے تھے اور غریبوں کے بچے انھیں گیند اٹھا کر دیتے تھے۔ پھر جب وہ میدان خالی کر دیتے تھے تو بیروں، خانساموں، چپراسیوں اور مہتروں کے بچے بلور کی گولیاں کھیلتے تھے۔ ایک بار سلطان نے بھی اس کھیل میں شامل ہونے کی کوشش کی تھی۔ چند روز تک کھیلا بھی تھا۔ مگر پھر ایک دن مہتر کے لڑکے نے انکشاف کیا تھا کہ سلطان تو اندھے بھکاری کا بچہ ہے۔ جب سے اسے کھیل میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ جب کوئی بچہ بلور کی گولی بہت دور پھینک بیٹھتا تو سلطان لپک کر یہ گولی اٹھا لاتا تھا اور مالک کے حوالے کرنے سے پہلے اسے چند بار انگلیوں میں گھما لیتا تھا۔ ایک بار دادا کے

سامنے دیر تک زار زار رو کر اس نے چند پیسے حاصل کر لئے تھے اور ان سے بلور کی گولیاں خرید لایا تھا۔ مگر جب میدان میں پہنچا تھا اور بچوں نے اس کے ہاتھ میں گولیاں دیکھی تھیں تو وہ یہ کہہ کر اس پر جھپٹ پڑے تھے کہ یہ تو ہماری گولیاں ہیں۔ اور بھلا بھکاریوں کے بچوں کے پاس بھی کبھی گولیاں ہوتی ہیں! وہ اس دن خوب پاؤں پٹخ پٹخ کر رو دیا تھا۔ مگر دوسرے دن پھر میدان میں جا نکلا تھا۔

ایک بار میدان میں آنے کے بعد اُسے واپس گھر جانے سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں دادا پھر سے اس کے سر کو اپنے سوکھے ہاتھ میں پکڑ کر اسے سڑک سڑک نہ لئے پھرے۔ اسے معلوم تھا کہ صبح کو آنکھ کھلتے ہی اسے دادا کے ساتھ گداگری نے نکل جانا ہوگا۔ اس لئے کھٹولے سے اُٹھتے ہی اُسے ایسا لگتا جیسے اس نے پتھر کی ٹوپی پہن لی ہے۔ دادا کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں درد کی پانچ لہریں بن کر اس کی کھوپڑی میں دوڑ جاتیں اور جب دادا نماز پڑھنے اور دعا مانگنے کے بعد لاٹھی سنبھالتا اور سلطان کو پاس بلا کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتا تو سلطان آدھا مر جاتا۔ دادا کا یہ ہاتھ سوتے جاگتے میں اُسے بھوت کی طرح ڈراتا تھا۔ یہ ہاتھ اسے گرفتار کر لیتا تھا۔ اور وہ بیڑی پہ یوں چلتا تھا جیسے ملزم ہتھکڑیاں پہنے سپاہی کے ساتھ چلتے ہیں اور پھر قید خانے کے صدر دروازے کے جنگلے میں سے باہر سڑک پر

لوگوں کو چلتا پھرتا ہنستا مسکراتا دیکھتے ہیں مگر بس دیکھتے رہ جاتے ہیں اور ان کی بصارت کے ساتھ سلاخیں صلیبوں کی طرح چمٹ جاتی ہیں۔

جب دادا کا ہاتھ اپنے سر پہ رکھے وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ تو کئی بار اس کا جی چاہا کہ گنڈیری والے کے خوانچے میں سے جو گنڈیری لڑھک کر گندی نالی کے کنارے جا کر رک گئی تھی، وہ لپک کر کھالے۔ بالو نے کیلا کھا کر جو چھلکا پھینکا ہے اُسے بڑھ کر اٹھالے اور ذرا سا چاٹ لے۔ مگر جب بھی اس نے کسی بہانے دادا سے ذرا سا رک جانے کو کہا تو دادا نے اپنی انگلیاں اس کے سر کی ہڈیوں میں گاڑ دیں اور بولا "میں تجھے ٹہلانے نکلا ہوں کہ تو مجھے گداگرانے نکلا ہے؟ ارے بدبخت۔ دن بھر میں چار پانچ آنے کی بھیک نہ ملی تو زینو بیٹی دو وقت کی روٹی ہمیں کیا اپنی گرہ سے کھلائے گی؟ اس کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ اس نے ہمارے سر چھپانے کو اپنی جھونپڑا دے رکھی ہے؟"

کافی دنوں کی بات ہے دادا بنگلوں سے بھیک مانگنے کے بعد جب مہتروں کے کوارٹروں کے پیچھے بگو کو جوان کے گھر وندے کے سامنے سے گذرا تو اس کی ماں زینو لپک کر آئی اور بولی "ارے بابا۔ دعا کر۔ اللہ میرے بیٹے کی پسلی کا درد ٹھیک کر دے۔ میں تجھے پورا ایک روپیہ دوں گی۔" دادا نے وہیں کھڑے ہو کر دعا مانگی تھی پھر چند روز کے بعد اس نے

سلطان کو دوبارہ انہی بنگلوں کی طرف چلنے کو کہا ابھی وہ بنگلوں تک نہیں پہنچے تھے کہ زبیدہ نے انھیں رستے ہی میں پکڑ لیا۔ دادا کو ایک روپیہ دیا اور بولی۔ "مجھے بتا تو کہاں رہتا ہے بابا۔ میں جمعرات کی جمعرات تیری سلامی کو آیا کروں گی" پھر جب اُسے معلوم ہوا تھا کہ یہ دادا پوتا تو کسی دکان کے چھجے تلے پڑے رہتے ہیں تو اس نے بیٹے سے کہہ کر چھپریا خالی کرادی تھی اور جب سے دونوں وہیں رہتے تھے۔ دن بھر کی بھیک اس کو لا دیتے تھے اور وہ اسی حساب سے انھیں روٹی پکا دیتی تھی۔ ان دنوں دادا سے وہ اپنے بیٹے کے اولاد ہونے کی دعا کرا رہی تھی۔

سلطان کو دادا کے علاوہ خالہ زبیدہ بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ جب بھی دادا کو واپس چھپریا میں پہنچا کر نکلا تو زبیدہ سے چھپ کر نکلا ورنہ وہ شور مچا دیتی تھی کہ لو دیکھو۔ اپنے بوڑھے اپاہج دادا کو اکیلا چھوڑ کر کھیلنے چلا ہے

جس روز دادا دن ڈھلے ہی تھک کر واپس آجاتا اور سلطان کو کھسک جانے کا موقع نہ ملتا تو ذرا سا سستا لینے کے بعد وہ پھر سے لاٹھی سنبھال کر کہتا "چل سلطان۔ چوک کا ایک اور چکر لگوا دے۔ آج کچھ زیادہ مل گیا تو کل تیری چھٹی" مگر یہ چھٹی کبھی نہیں ملتی تھی۔ اس لئے کہ کچھ زیادہ کبھی نہیں ملتا تھا۔

البتہ اب کچھ عرصے سے یوں ہونے لگا تھا کہ دادا کو آدھی رات

کے بعد دمے کے دورے پڑتے اور وہ کھانس کھانس اور ہانپ ہانپ کر صبح تک ادھ موا ہو جاتا۔ اس روز وہ گدا پہ نہیں نکلتا تھا مگر سلطان کو جب بھی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ وہ دن بھر بیٹھا دادا کے کندھے اور پسلیاں دباتا رہتا اور اس کے ہاتھ رکتے تو دادا کھانسی سے بھینچی ہوئی آواز میں پکارتا۔ "کیوں سلطان۔ کیا کر رہا ہے؟ مر تو نہیں گیا؟"

سلطان فوراً دادا کے کندھے پکڑ لیتا اور جی میں کہتا۔ "اللہ کرے تو خود مر جائے دادا۔ تو مر جائے تو اللہ قسم کیسے مزے آئیں۔ اللہ کرے تو جلدی جلدی سے بس ابھی ابھی مر جائے اور میں بنگلے کی بی بی سے اس کے بچے کی ٹوپی کی بھیک مانگ کر اپنا سر ڈھانپ لوں۔"

پھر ایک روز دادا سچ مچ مر گیا۔ وہ ٹوٹی رات تک سر کو گھٹنوں پر رکھے کھانستا اور ہانپتا رہا اور اس کی پسلیاں پھنکتی اور سمٹتی رہیں سلطان اس کے کندھے دباتا رہا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کے کناروں کو انگوٹھوں کی پوروں سے سہلاتا رہا۔ پھر وہ سو گیا۔ اور جب صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو روتی ہوئی خالہ زبیدہ نے اسے بتایا کہ سلطان۔ تیرا دادا تو اللہ کو پیارا ہو گیا۔

ایکا ایکی سلطان کے اندر چار طرف پھلجھڑیاں سی چھوٹیں اور وہ بولا۔ "سچ؟ جیسے اسے یقین نہیں آ رہا کہ دادا لوگ بھی مر سکتے ہیں۔ پھر بنگو کبوتر آس پاس کے لوگوں کو جمع کر لایا اور وہ دادا کو غسل دے کر دفنانے لے گئے۔

خالہ زبیدہ وقفے وقفے سے روتی رہی اور اس کی بہو نے بھی سلطان کو بڑے پیار سے دن بھر اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ بگو بھی قبرستان سے واپس آیا تو سلطان کے لئے گنڈیریاں لیتا آیا اور گنڈیریاں چوستے ہوئے سلطان نے سوچا۔ جب دادے مرجاتے ہیں تو کیسے مزے آتے ہیں۔

رات بھی خالہ زبیدہ نے اسے چھپریا میں نہ جانے دیا کہ بچہ ہے ڈر جائے گا۔ صبح کو اس نے سلطان کو رات کی ایک چپاتی اور لسّی کا ایک پیالہ دیا۔ خوب پیٹ بھر کر وہ اٹھا تو زبیدہ نے پوچھا "کہاں چلے بیٹا؟"

سلطان کو یہ سوال بڑا عجیب سا لگا۔ ہم کہیں بھی جائیں، اس نے سوچا، ہمارا دادا تو مرگیا ہے۔

سلطان کو خاموش پاکر وہ بولی۔ "نہیں بیٹا۔ بھکاری لوگ کھیلتے ویلتے نہیں ہیں۔" پھر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر چھپریا میں لے آئی اور کٹورا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ "بھکاری لوگ بھیک نہ مانگیں تو کھائیں کہاں سے۔ آج کہیں سے آٹھ دس آنے کما لا۔ میں تجھے چاول کھلاؤں گی۔ جا بیٹا کسی آباد سڑک کا ایک پھیرا لگا لے۔ اللہ تیرا ساتھی ہو۔"

سلطان نے ہاتھ میں کٹورا لے لیا مگر چھپریا سے باہر آتے ہی وہ رک گیا۔ واپس چھپریا میں گھسا جیسے کچھ بھول آیا ہے۔ پھر وہ بلبلا کر رو دیا اور خالہ زبیدہ کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے کترا کر بھاگ نکلا۔

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا جب اس نے سڑک پر ایک بابو کے سامنے کٹورا پھیلایا۔ "بابو جی۔ اندھے فقیر کو راہِ مولا ایک روٹی۔" اس نے زار زار روتے ہوئے دادا کے الفاظ دہرا دیئے۔

"کیا تو اندھا ہے؟" بابو نے سختی سے پوچھا۔

سلطان کو یکایک اپنی غلطی کا احساس ہوا اور گھبرا کر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"جھوٹ بھی بکتا ہے اور روتا بھی ہے؟" بابو نے ڈانٹا۔ "نوکری کرے گا؟" اس نے پوچھا اور پھر سلطان کو مسلسل روتا پا کر جانے لگا۔

سلطان رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہے بابو جی۔ راہِ مولا پیسہ دو پیسے دیتے جاؤ۔"

بابو پلٹے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ کافی دور نکل گیا تھا جب روتا ہوا سلطان یکایک اس کی طرف دوڑنے لگا اور پکارنے لگا "بابو جی۔ ہے بابو جی۔"

بابو رک گیا۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ بھی ٹھٹھک گئے۔

"نوکری کرے گا؟" بابو نے پوچھا۔

"بابو جی۔" ہانپتا ہوا سلطان بابو کے پاس رکا۔ پھر اس کا نچلا ہونٹ ذرا سا لٹکا اور وہ بولا "بابو جی ۔۔۔ دیکھئے۔ میں نوکری نہیں مانگتا۔ بھیک

نہیں مانگتا؟" اس نے کٹورا زمین پر پٹخ دیا۔

"تو پھر مجھے کیوں پکارا؟" بابو نے جمع ہوتے ہوئے لوگوں پر ایک نظر دوڑا کر ذرا تلخی سے پوچھا۔

ایک دم سلطان کی آنکھوں میں اکٹھے بہت سے آنسو آ گئے۔ اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے اور وہ بڑی مشکل سے بولا۔ "بابو جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ خدا آپ کو بہت بہت دے۔ کیا آپ ذرا دور تک میرے سر پر ہاتھ رکھ کر چل سکیں گے؟"

"لو اور سنو" بابو احمقوں کی طرح ہجوم کو دیکھنے لگا۔

(مئی ۱۹۶۱ء)

بھاڑا

میں نے اسے بچپن میں بھی دیکھا تھا، مگر بچپن میں تو سبھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوں گے جن کے اعضا جوانی کی آنچ میں پھیل نہ جائیں یا ٹھٹک نہ پڑیں۔ مُلکھاں اپنی بہت کم لوگوں میں سے تھی۔ چودہ پندرہ برس بعد میں اسے دیکھتے ہی محقق بن گیا ـــــ یہ مُلکھاں دراصل مُلکاں کا بگاڑ ہے اور مُلکاں درحقیقت مُلکہ ہے۔ اور اگرچہ مُلکاؤں میں بعض بڑی بہ ہیئت شخصیتیں بھی گذری ہیں مگر ملکہ کے ساتھ حسن کا وصف عموماً بڑی شدت سے وابستہ رہا اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ لاکھوں کروڑوں عورتوں میں سے اگر ایک عورت کو منتخب کرنا ہو، تو بدذوق بادشاہ سے بھی حسنِ انتخاب سرزد ہو سکتا ہے۔

مُلکھاں فقط حسن کے نعاشے میں ملکہ تھی ورنہ دراصل وہ جھیورن تھی۔ میں نے اسے پندرہ برس کے بعد اس وقت دیکھا جب اس کے سر پہ پانی سے

بھرے ہوئے دو گھڑے تھے اور وہ بائیں ہاتھ کو اوپر والے گھڑے کے ابھار پر رکھے اور دائیں ہاتھ کو تلوار کی طرح لہراتی، ایک گلی کی بلندی سے اتر رہی تھی مشقت کے اس لمحے میں وہ مجھے اتنی خوبصورت لگی کہ اس کے جسم کے خطوط اور چہرے کے نقوش کی طرف میرا دھیان ہی نہ گیا۔ اب سوچتا ہوں تو بس اتنا یاد آتا ہے کہ اس کے اٹھے ہوئے بازو پر سے سیاہ کرتے کی کھلی آستین اس کے کندھے تک ڈھلک گئی تھی۔ اور اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو رہا تھا اور اس کی ناک کی نوک اور ٹھوڑی پر پسینے کے دو بڑے بڑے قطرے ٹپکنے کے لئے بے قرار تھے۔

مگر جب میں نے دو دن بعد اسے تنور کے سامنے بیٹھے دیکھا تو اس کے حسن نے اپنی تفصیل بیان کر دی۔ زمین میں دھنسے ہوئے بہت کھلے دہانے والے بڑے سے تنور کے پاس وہ یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پیچھے دیوار تھی۔ سامنے تپا ہوا تنور تھا اور تنور کے تین طرف کچے سے کھلے چبوترے پر گاؤں کی ایک ڈیڑھ درجن عورتیں چنگوں میں گوندھا ہوا آٹا رکھے، اپنی اپنی باری کی منتظر تھیں۔ ملکھاں نے اپنے سر، چہرے، سینے اور دائیں بازو پر موٹے میلے کپڑے کی چوڑی چوڑی پٹیاں لپیٹ رکھی تھیں تاکہ جب روٹی لگانے کے لئے وہ تنور میں جھکے تو اس کے جسم کے یہ حصے جھلسنے نہ پائیں۔ پوری پٹیوں میں لپٹے ہوئے اس کے چہرے پر اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اور

یہی آنکھیں اس کے حسن کی تفصیل تھیں۔
ملکھاں کے نکلنے کے بعد میں نے گزشتہ پندرہ برس میں چند بار اسے ضرور دیکھا ہوگا ورنہ میں اسے پہچانتا کیسے! مگر یہ دیکھنا کچھ اس قسم کا دیکھنا تھا جیسے ایک مسافر چیت کے مہینے میں کھیتوں کی مینڈوں، سبزہ زاروں کی چھدرکیوں اور پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزر رہا ہو اور دیکھ رہا ہو کہ ہر طرف جنگلی پھول اگ رہے ہیں۔ اگ نہیں رہے ہیں، اُمڈ رہے ہیں۔ گلابی اور بسنتی، نیلے اور پیلے ——— موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ننھے ننھے ذرا ذرا سے پھول — جنہیں دیکھ کر مسافر کو اپنا سفرِ گلگشت معلوم ہو، لیکن جو منزل پہ پہنچ کر ان پھولوں کی کوئی تفصیل بیان نہ کر سکے۔ میں مسافر ہی تو تھا جو سال دو سال میں اپنے گاؤں کا ایک آدھ چکر لگا لیتا تھا اور ملکھاں ہزاروں جنگلی پھولوں میں سے ایک پھول تھی، اور میں ان پھولوں کے بارے میں یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ یہ پھول چار اور وہ پھول پانچ پتیوں پر مشتمل ہے یا اس پھول کی پتیوں کے کنارے گول اور اس کے دندانے دار ہیں۔
اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک مجھ سے ملکھاں کی آنکھیں کیسے چھپی رہ سکتی تھیں۔ انسان کے جسم کا سب سے بلیغ حصہ اس کی آنکھیں ہیں۔ زبان سے جذبات کا اظہار ادھورا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی۔ لیکن آنکھیں کبھی

جھوٹ نہیں بولتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی انسان سے ملتا ہوں تو سب سے پہلے میری آنکھیں اس کی آنکھوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کہیں مجھے سمندر نظر آتے ہیں اور کہیں صحرا۔ کہیں ان میں تارے چمکتے ہیں اور کہیں چراغ بجھتے ہیں۔ ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں کہ غور سے نہ دیکھو تو گناہ کا احساس ہونے لگے اور غور سے دیکھو تو ڈوب جاؤ۔

اس کے باوجود پندرہ برس بعد جب میں نے ملکھاں کو گلی کی بلندی طے کرتے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں تک پہنچنے میں خاصی دیر لگی اور جب تک میں اس کی آنکھوں میں جھانکتا، وہ "رد بلائیں دور بلائیں" کے بغیر مقدمی الفاظ بولتی میرے قریب سے نکل گئی تھی۔ لیکن دو دن بعد جب میں نے اسے تنور کے سامنے حفاظتی پٹیوں میں لپٹا ہوا دیکھا تو جس طرح اس روز اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا۔ اسی طرح آج اس کا سارا حسن اس کی آنکھوں میں رچ گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو اس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے ان میں دونوں جہاں نظر آ گئے۔ وہی ابہام جو خمار شکن بھی ہے اور خمار آور بھی۔ اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو جیسے صدیاں گزر گئیں۔

بوڑھی عورتوں، جوان لڑکیوں اور کم سن بچیوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ بعض آٹا بھی گوندھ رہی تھیں اور غیر ہموار زمین پر ان کی صحنکیں بج رہی تھیں اور چوڑیاں کنگنوں سے بج رہی تھیں اور بالیاں بالیوں سے بج رہی تھیں۔

اس مدھم، منتشر مگر مسلسل موسیقی میں گھرا ہوا تنور دہک رہا تھا اور دہکتے ہوئے تنور میں روٹی لگائی جائے تو چپل جاتی ہے۔ یا لٹک کر گر پڑتی ہے۔ اسی لیے آج میں کمی کا انتظار ہو رہا تھا اور ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"بس اتنی سی دیر لگی کہ بچہ ہوا تو سب آنکھیں بھاگاں مر گئی۔ اور جب بھاگاں نے آنکھیں کھولیں تو بچہ مر چکا تھا۔"

"ہائے بیچاری کا تیسرا تھا۔"

"تیسرا کیوں بہن؟ چوتھا کہو۔ شادی سے پہلے والا بھی تو گنو۔"

"خدا کے لیے ماسی" ملکھاں پہلی بار بولی۔ مگر اس کے ہونٹ بھی پٹیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اس لیے اس کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "خدا سب کے پردے رکھے۔ آہستہ بولو۔ مرد لوگ بیٹھے ہیں۔"

میں تنور کے چبوترے سے جڑے ہوئے چھپر کے نیچے مرد لوگوں ہی کے پاس بیٹھا تھا۔ ملکھاں کے شوہر نے مجھے اپنے بھائی کا خط پڑھنے کے لیے گلی میں سے بلا لیا تھا اور اگرچہ میں خط کب کا پڑھ چکا تھا مگر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ یہ نوجوان بھیوڑیوں اطمینان سے حقے کے کش لگا کر دھوئیں کو اپنی گھنی مونچھوں میں سے گزارتا تھا جیسے تنور کے کنارے اس کی باوردی بیوی نہیں بیٹھی ہے۔ ایک مشین رکھی ہے اور ابھی جب شام گہری ہو جائے گی تو یہ مشین گوندھا ہوا ڈھیر سا آٹا اٹھا کر اس کے سامنے لا ڈالے گی۔ وہ جب حقے

کا دھواں نکالتا تو قریب ہی کھڑا ہوا اس کا بڑا بیٹا دھوئیں میں سے بار بار ہاتھ گزار کر دھوئیں کو کاٹنے کی کوشش کرتا اور کھردّے کھٹولے پر لیٹا ہوا اس کا چھوٹا بچہ زور سے کلکاری مارتا۔ "مرد لوگ" بس یہی چار نفوس پر مشتمل تھے۔

ملکھاں نے قریب رکھی ہوئی دوَری میں سے چلو سے پانی لے کر تنور کے چار طرف بار بار چھڑکا تو تنور اژدھے کی طرح بار بار پھنکارا۔ ملکھاں کے قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت نے صحنک میں سے آٹے کا پیڑا اٹھا کر ملکھاں کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور ملکھاں بولی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!"

پیڑے کو دونوں ہاتھوں میں چٹاخ پٹاخ بجاتے ہوئے ملکھاں نے کہا۔ "ذرا چھوٹا پیڑا بنایا کر بہن۔ بڑے پیڑے کی روٹی موٹی بنتی ہے۔ کچی رہ جاتی ہے اور پھر تم نام دھرتی ہو۔"

پھیلی ہوئی روٹی کو دائیں ہاتھ پر پھیلا کر ملکھاں گھٹنوں کے بل ذرا سی اٹھی، پھر جھکی اور تپتے ہوئے تنور میں جیسے غائب ہو گئی۔ فوراً بعد وہ ابھری، پھیلے ہوئے ہاتھ پر دوسرا پیڑا لیا۔ چٹاخ پٹاخ روٹی بنائی اور پھر سے تنور میں جیسے اتر گئی۔

ایک بار نیا پیڑا لینے میں اسے ذرا سی دیر لگی تو میں نے دیکھا کہ تنور میں جھکتے ہی وہ تپش سے بچنے کے لئے اپنی آنکھیں میچ کر ان پر پلکیں پھیلا دیتی ہے اور جب تنور سے ابھرتی ہے اور میچی ہوئی آنکھیں کھولتی ہے تو ایسا لگتا ہے

جیسے اُن میں آگ بھر لائی ہے۔

روٹی کو دائیں ہاتھ پر رکھتے ہی وہ گھٹنوں کے بل اٹھتی تھی اور بائیں ہاتھ سے تنور کی منڈیر پر تھام کر آدھے دھڑ کو تنور کے حوالے کر دیتی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ زمین میں دھنسے ہوئے اتنے کھلے اور اتنے گہرے تنور کے اوپر سے نیچے چار طرف روٹیاں لگاتے ہوئے وہ اپنا توازن کیسے قائم رکھتی تھی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میرا دل بار بار کیوں ڈوبتا اور ملکھاں کے شوہر کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی کہ "دوجا لڑکے۔ اندر سے پنکھا اٹھا لا اور میاں جی کو جھل۔ پسینے پسینے ہو رہے ہیں۔ دیکھئے میاں جی۔ روزی کی بات ہے ورنہ میں آپ کی منت کرتا کہ شہر کو گولی ماریئے، دیکھئے تو آپ کیسے پیلے پیلے بالکل ہلدی سمان ہو رہے ہیں۔"

لڑکا سچ مچ میرے پنکھا جھلنے لگا اور ملکھاں بار بار دہکتے ہوئے تنور میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ ایک عورت سے اس کی تکرار بھی ہو گئی۔ ہر عورت پیڑے دینے کے بعد گوندھے ہوئے آٹے کا بھاڑا ملکھاں کے حوالے کرتی تھی۔ یہ بھاڑا پانی والی دوری کے پاس رکھی ہوئی بڑی سی ایک صحنک میں جمع ہو رہا تھا۔ بھاڑا روٹیوں کی تعداد کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا تھا مگر اس عورت نے چھ پیڑے دینے کے بعد ملکھاں کو جو بھاڑا دیا وہ اتنا کم تھا کہ دوسری عورتیں بھی حیران رہ گئیں۔ ملکھاں نے بھاڑا ہاتھ میں لے کر اسے ایک گیند کی طرح

انگلیوں کی پوروں میں گھمایا اور بولی "لڑکیاں اپنی گڑیوں کے لیے جو روٹیاں پکاتی ہیں، ان کا پیڑا بھی اس بھاڑے سے تو بڑا ہی ہوتا ہے۔ دیکھ بہن۔ میرے بچوں کا باپ دن بھر جنگلوں میں ٹھبک ٹھبک کر جھاڑ جھنکار کے ڈھیر لادلاتا ہے۔ اس سے میں تنور تپاتی ہوں۔ پھر اپنے آدھے دھڑ کو ہاڑ کی اس گرمی میں، اس دوزخ میں بار بار جھونکتی ہوں۔ اس پر بھی اگر مجھے اپنی محنت کا یہ بھاڑا ملے تو بہن۔ اس سے تو اچھا یہ ہے کہ تو مجھے بھاڑا نہ دیا کر، میرے بچوں کے لئے دعا کر دیا کر۔"

عورت چلا اٹھی "تو کیا میں فقیرنی ہوں کہ تجھ سے مفت میں روٹیاں پکواؤں؟"

ملکھاں نے جواب دیا "فقیر ہم بھی نہیں ہیں بی بی۔ ہم بھی اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہیں، بھیک نہیں مانگتے۔"

عورت نے پھر کوئی جواب دیا۔ دوسری عورتیں بھی بولنے لگیں۔ ملکھاں نے بھی کوئی بات کی مگر پھر اس نے پوروں میں تھمے ہوئے آٹے کو بھاڑے والی صحنک میں دے مارا اور نئے پیڑے کے لئے ہاتھ یوں تیزی سے پھیلایا جیسے میان سے تلوار نکالی ہے۔ خاموشی چھا گئی۔ صرف ملکھاں کی آنکھیں بولتی رہیں۔ وہ کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی، کالی، سوچتی ہوئی آنکھیں، جو کسی ملکہ کے چہرے پر ہوتیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں۔

تنور کی سب روٹیاں اتر گئیں تو ملکھاں اٹھی۔ عورتیں چبوترے کے کنارے

تک برٹ گئیں اور ملکھاں کے شوہر نے صحن کے گوشے میں پڑے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ کے ایک انبار پر ہاتھ مارا۔ ایک ڈھیر اٹھا کر تنور میں جھونک دیا۔ شعلہ ایک دھماکے کے ساتھ بلند ہوا۔ لکڑیاں جیسے چٹکیاں بجانے لگیں۔ چنگاریوں کا ایک فوارہ آسمان کی طرف چھوٹا اور تنور پھر سے تپنے لگا۔

ملکھاں جو دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ یکایک وہاں سے ہٹی اور اپنے چھوٹے بچے کے پاس آ گئی۔ میں نے صرف آنکھیں دیکھنے کے لیے اس سے پوچھا۔

”اس کا کیا نام رکھا ہے؟“

”بازا“ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اور اس کے ہونٹوں نے جو پتیوں میں چھپے ہوئے تھے، اپنی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کے حوالے کر دی۔ اللہ اکبر! یہ آنکھیں تو خدا کے وجود کا ثبوت تھیں۔

میں نے اس سے بڑے بیٹے کا نام پوچھا۔ پھر یہ پوچھا کہ کیا انہیں پڑھاؤ لکھاؤ گی؟ پھر یہ کہ تمہارا دیور لائل پور کی کسی مل میں ملازم ہے اور تمہارے شوہر کو کچھ بھیجتا بھی ہے یا جو کماتا ہے وہ کھا جاتا ہے؟ ان سوالوں کا مجھے صرف ایک ہی جواب درکار تھا اور یہ جواب اس کی آنکھیں تھیں۔

میں نے ان چند لمحوں میں بڑی تفصیل سے اس کی آنکھوں کا مطالعہ کیا۔ میں ”بڑی تفصیل“ کی جگہ ”جی بھر کر“ کے الفاظ بھی استعمال کر سکتا تھا مگر ایسا کر کے میں جھوٹ بھی بولتا اور ان آنکھوں کی ہتک کا بھی مرتکب ہوتا۔ اگر ان آنکھوں

کو جی بھر کر دیکھا جا سکتا تو وہ عام آنکھیں ہوتیں مگر وہ عام آنکھیں نہیں تھیں۔

ان آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ اگر رات اتنی سیاہ ہوتی تو سورج کو طلوع ہونے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی۔ سفید حصّہ اتنا سفید تھا کہ ہلکا نیلا ہو رہا تھا۔ ڈوروں کا گلابی رنگ شاید تنور کی آنچ کی وجہ سے سرخی میں بدل گیا تھا۔ ان آنکھوں پر لمبی لمبی گنجان پلکوں کی چھاؤنی چھا رہی تھی۔ پلکوں کی یہ توسیں جیسے آنکھوں کے خزانے پر کمانیں تانے پہرہ دے رہی تھیں۔ وہ پلکوں کو بہت نرمی سے جھپکتی تھی۔ نہایت آہستہ، جیسے اسے نیند آ رہی ہے مگر وہ نیند کو روک رہی ہے۔

میرے سوالوں کی بوچھاڑ کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور جھکائے رکھیں۔ مجھے اپنے ندیدے پن سے دوہری کوفت ہوئی۔ ایک اس لیے کہ وہ کسی حد تک میرا مقصد بھانپ گئی تھی۔ اور دوسرے اس لیے کہ وہ جھکی ہوئی آنکھیں لیے تنور کی طرف پلٹ گئی

شعلے بیٹھ گئے تھے اور تنور کی دیواریں دہکنے لگی تھیں۔ ملکھاں تنور کی طرف چل دی تھی۔ اور اس کی جگہ اس کا شوہر میرے پاس آ گیا تھا۔ تنور کے کنارے بیٹھ کر اس نے ماتھے کی پٹی کو بھوؤں تک کھینچا اور دائیں بازو کی پٹی کی لٹکتی ہوئی ایک دھجی کو وہیں کہیں اڑس کر تنور میں جھانکی اور شوہر سے بولی۔ ”وہ حقہ تازہ کر کے میاں جی کو بھی پلا۔ اتنی دیر سے بیٹھے ہیں۔ کیا کہیں گے۔“

چوپال پر آ کر میں نے تنور میں روٹیاں لگانے کے سلسلے میں جھیورنوں کی بے پناہ مشقت کا ذکر چھیڑا تو سب میرے پیچھے پڑ گئے۔ سب کی شکایت تھی کہ جھیورنیں تو مفت کا بھاڑا لیتی ہیں ـــــــ وہ اور پھر جو کچھ کماتی ہیں وہ اتنا بہت سا ہوتا ہے کہ پورا کھا بھی نہیں سکتیں۔ بڑے گھروں کی وہ عورتیں جو آٹا گوندھنے کا وقت نہیں نکال سکتیں، کہلوا بھیجتی ہیں کہ اتنی روٹیاں بھجوا دو۔ یہ روٹیاں اسی بھاڑے سے ملتی ہیں اور بدلے میں مہینے آدھ مہینے بعد جھیورنیں ہر گھر سے من من آدھ آدھ من گندم سمیٹ لے جاتی ہیں۔ پھر بھی آٹا بچ جاتا ہے۔ اور وہ الٹے ٹھکوں پہ آٹے کی موٹی موٹی رسیوں کی سی سویاں بٹتی ہیں اور انہیں گڑ کے بھاؤ بیچتی ہیں۔ آپ شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کیا جانیں کہ یہ جھیور، موچی، لوہار، کمہار ہمیں کس کس طرح دونوں ہاتھوں لوٹ رہے ہیں!

ملکھاں کے دونوں ہاتھ میرے سامنے ابھرے۔ آٹے میں رہتے ہوئے ہاتھ جو پیڑے کو روٹی میں بدلنے کے لیے حرکت میں آئے تو جیسے کائنات تخلیق ہونے لگی۔ ملکھاں کا دایاں بازو کندھے تک پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور اسی ہاتھ پہ پھیلی ہوئی روٹی تھی۔ بایاں ہاتھ تنور کی منڈیر کو جکڑے ہوئے تھا اور تنور کی دیوار تانبا ہو رہی تھی اور نیچے تہ میں انگارے دہک رہے تھے۔ پھر ملکھاں نے گھٹنے ٹیکے، جھکی اور اس کا آدھا دھڑ تنور میں غرق ہو گیا اور اس کا بیٹا میرے پنکھا جھلنے لگا۔ اور چوپال پر سے آواز آئی کہ جیسی

گرمی اب کی سال پڑی ہے ویسی پچھلی ایک صدی سے نہیں پڑی۔ پھر جب ملکھاں اٹھی اور پٹیوں میں لپٹے ہوئے چہرے پر اس کی میچی ہوئی آنکھیں کھلیں تو جیسے وہ شعلے پی آئی تھیں۔ یہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ سلگ رہی تھیں اور ان کے ڈوروں میں چنگاریاں بھر گئی تھیں اور ان کے پپوٹوں پر کاجل کی بجائے راکھ کے ذرے بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے گوندھے ہوئے آٹے کے ذرا ذرا سے بھاڑے کے گولے ناچ رہے تھے۔

لوگ جب گرم گرم روٹیاں کھاتے ہیں تو اگر ملکھاں کے ہاتھوں کو یاد نہیں رکھ سکتے تو اس کی ان آنکھوں کو کیسے بھول جاتے ہیں جو اگر ملکھاں کی بجائے ان کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کے چہرے پر ہوتیں تو وہ دنیا کے سارے تنکے اپنی آنکھوں میں بھر لیتے تاکہ ان کے پیاروں کی آنکھیں محفوظ رہیں۔

گاؤں میں قیام کے دوران میں ملکھاں کو میں نے اس کے بعد دو بار دیکھا۔ ایک بار وہ ٹین کے ننھے سے چراغ میں مٹی کا تیل ڈلوا کر نکلی تو ادھر سے میں گزر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولی ''رد بلائیں دور بلائیں'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لمحے کو ذرا سا طول دینے کے لیے پوچھا۔ ''چراغ میں تیل ڈلوایا ہے؟'' جواب میں اس نے ''جی'' کہا مگر یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں جھکا لیں اور میں جیسے تنور میں اتر گیا۔

دوسری بار میں ایک چھوٹا سا بہانہ بنا کر ملکھاں کے ہاں اس وقت

جا نکلا۔ جب عورتیں سروں پہ چنگیروں سے ڈھکی ہوئی صحنکیں رکھے روٹیاں پکوانے جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس کا شوہر گھر میں نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے اسے چوپال کی گلی میں سے جاتا ہوا دیکھ آیا تھا مگر میں نے آتے ہی اسی کا پوچھا۔ ملکھاں تنور کے سامنے پیڑھوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی اور تنور کی آنچ میں کمی کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آنکھیں جھکا لیں اور بولی "جی وہ رودھنے شریف پر سے خاک پاک لانے گیا ہے۔ ننھے کو چٹانے کے لئے۔ کل سے اسے عجیب سی کھانسی اٹھ رہی ہے۔"

"اوہو" میں نے کہا۔ اس سے زیادہ کہنے کا مقدور ہی نہیں تھا اور اگر میں کچھ کہنے کی ہمت کر بھی لیتا تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا تھا کہ یوں آنکھیں نہ جھکا لیا کرو۔ اس طرح آسمان بالکل سر پہ جھک آتا ہے۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے سوچا کہ کچھ کہنے کا یارا نہیں تو پلٹ کر دیکھ ہی لوں۔ مگر میری یہ حرکت میرے بہانے سے بھی زیادہ بھونڈی ہوتی سو چلا آیا۔ مگر اب یہ مشکل آ پڑی کہ میں جب بھی ملکھاں کی آنکھوں کو تصور میں لاتا، انہیں جھکا ہوا ہی پاتا۔ میں اپنے آپ سے لڑتا رہا کہ آخر ایسا بھی کیا۔ آخر میں نے اس کی کھلی آنکھوں کو بھی تو دیر تک اور اتنے قریب سے دیکھا ہے اور ان میں وہ کچھ پایا ہے جو پوری زندگی میں نہیں پایا۔ پھر جب

میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ منہ کیوں جاتی ہیں۔ میں نے طے کیا کہ کل شام اس کے ہاں جا کر بے حیاؤں کی طرح بیٹھ جاؤں گا اور اس سے ادھر اُدھر کی بہت سی باتیں کروں گا۔ اور جب وہ اپنی آنکھوں کی پوری لمبائی اور گہرائی سے مجھے ایک بار دیکھے گی تو میں فوراً وہاں سے اٹھ آؤں گا تاکہ ان بھرپور آنکھوں کے تصور سے میرا ذہن ہمیشہ جاگتا رہے۔

دوسرے دن شام سے پہلے مجھے ایک معقول بہانہ بھی سوجھ گیا۔ آخر اس کا بچہ بھی تو بیمار تھا۔ اور جب میں بچے کی مزاج پرسی کروں گا تو اس کی آنکھیں یقیناً جھکنا بھول جائیں گی۔

میں گھر سے نکلا۔ ابھی ملکھاں کے گھر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ہی تھا کہ یکایک بہت سی عورتوں کی چیخیں ایک طوفان کی طرح اٹھیں۔ پھر آس پاس کی گلیوں میں سے لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور ملکھاں کے گھر میں گھس گئے۔ پھر مردوں کی اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں اور عورتوں کی چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں۔

میں بھاگا اور ملکھاں کے گھر میں داخل ہو گیا۔

ملکھاں کے سر، چہرے، سینے اور بازو پر لپٹی ہوئی پٹیوں کو نوچ کر پھینک دیا گیا تھا اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اور عورتیں ایک نوواردہ عورت کو بتا رہی تھیں وہ نوراں سے بھاڑ لے کر اس نے صحنک

میں رکھا۔ پھر ایک پیڑے کی روٹی بنا کر تنور میں جھکی تو تنور کی منڈیر ٹوٹ گئی اور وہ سر کے بل تنور کی تہ میں جا گری۔ مگر اِدھر گری، اُدھر اس کا گھر والا بجلی کی طرح آیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نکال لیا۔ قدرت خدا کی جو حصہ انگاروں پہ گرا اس پہ پٹیاں بندھی تھیں اس لئے بچ گئی۔ بس یہ ہوا ہے کہ بے چاری کی آنکھیں چھن گئی ہیں۔"

(جنوری ۱۹۶۲ء)

بندگی بے چارگی

کتنی عجیب بات تھی کہ امین تو ڈیوڈ اینڈ ڈیوڈ لمیٹیڈ میں اکاؤنٹنٹ تھا اور کوٹ پتلون پہنتا تھا اور جب اُردو بھی بولتا تھا تو آدھی انگریزی بولتا تھا، مگر اس کی منگیتر اب تک کھیتوں پہ سے چڑیاں اُڑاتی اور ماہیا گاتی تھی۔ امین شہری بود و باش کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ چھٹی پر گاؤں آتا تو بہت سی ڈبل روٹیاں ساتھ لاتا، تاکہ ناشتے میں توس مکھن سے محروم نہ رہے اور جب اس کی ماں توے پہ توس سینکتی تو وہ سوچتا کہ اس وقت بانو دہی بلو رہی ہوگی اور جب وہ چائے کی پیالی میں چینی ملا رہا ہوگا تو لسّی کے کٹورے میں نمک ملا رہی ہوگی اور اس کی مہین مہین گندھی ہوئی مینڈھیوں کے نیچے چھپی ہوئی اس کے کانوں کی بالیاں آپس میں بج رہی ہوں گی! اور اس کی لمبی گھنی پلکوں کے سائے اس کے گالوں پہ دوڑ گئے ہوں گے اور اس کی گردن کی مکھن ایسی سفیدی نے اس کی رگوں کو اور زیادہ نیلا کر

دیا ہوگا، اور ـــــ،

کتنی عجیب بات تھی کہ امین نے جب بھی اپنے اور بانو کے درمیان معاشرتی تفاوت کے بارے میں سوچا، اُس کا ذہن آخرکار بانو کی گردن اور گریبان تک پہنچ گیا۔ اسی لیے تو وہ اپنے ٹھیٹ شہری تمدّن کے باوجود ایک الھڑ دیہاتی لڑکی کے ساتھ اپنی منگنی قائم رکھے ہوتے تھا۔ شہر کے جس محلّے میں وہ رہتا تھا اور جس دفتر میں کام کرتا تھا وہاں اسے ایک سے ایک اچھا رشتہ پیش کیا گیا، مگر اس اچھائی کا محور ان لڑکیوں کا حُسن نہیں تھا جہیز تھا یا ان کے والدین کی دولت تھی۔ جمالیات میں نہ سہی، معاشیات میں تو دولت بھی بہت بڑا حُسن ہے، مگر امین کا لاشعور اب تک دیہاتی تھا۔ بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ جب مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے ہوا بس جاتی تھی تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ باہر جا کر بھیگی دھرتی کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔ اُسے گلاب کا پھول اس لئے بھلا لگتا تھا کہ وہ پھول ہے، اس لیے نہیں کہ اُس سے گلقند بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے سونے چاندی کی طرف دیکھنے سے پہلے لڑکیوں کو دیکھا اور جب بھی دیکھا، دہی بلوتی ہوئی بانو ذرا سی مسکرا دی اور وہ رشتے کی بجائے موسم کی باتیں کرنے لگا۔

جب گاؤں میں خبر پہنچی کہ امین ساڑھے تین سو ماہانہ پہ ایک ولایتی فرم میں اکاؤنٹنٹ ہو گیا ہے تو بانو کے والدین نے صرف اتنا کیا کہ اُسے

پانی بھرنے کے لئے کنوئیں پر جانے سے روک دیا اور بانو اس پابندی پر یوں رو دی جیسے اُسے مایوں بٹھا دیا گیا ہو، اس روز گھر سے کنوئیں تک کی وہ کون سی چیز تھی جو اُسے یاد نہ آئی تھی۔ اُسے تو وہ چیزیں بھی یاد آگئیں جن کی طرف غور سے دیکھنے کا اُسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ لوہاروں کے گھر کے پاس آک کی جھاڑی پر سوسنی پھول، میرداد کا کتا جو دن بھر دہلیز پر بیٹھا آتی جاتی لڑکیوں کو غنڈوں کی طرح گھورتا رہتا تھا۔ گلی میں جھکی ہوئی شیر خاں کے صحن کی بیری پر پھیلی ہوئی امربیل، جس کے پیلے دھاگوں کو بچے ذرا سا کھینچتے تھے تو بیری کی پھننگ تک ہل جاتی تھی، قصبے سے آتے ہوئے ہرکارے کی مونچھیں جن میں سے ایک ہمیشہ کھڑی ہوئی اور دوسری ہمیشہ گری ہوتی تھی۔ کنوئیں پر نوراں نائن کے گندے لطیفے جنھیں سن کر لڑکیاں کانوں کی لوئیں چھو کر توبہ توبہ کرتی تھیں اور پھر سب خوب ہنستی تھیں! بانو سے جیسے ایک دم سارا گاؤں چھن گیا تھا اور جب باپ چلا گیا اور اُس نے ماں سے فریاد کی کہ ”ماں ــــ مجھے جو چاہو بنا دو، پر بی بی جی نہ بناؤ۔“ تو اس کی ماں مسکرا دی تھی۔ بالکل اُس ساس کی طرح جس کی بہو درد دں سے بے چین ہو کر پکارتی ہے۔ ”ہائے اللہ مجھے بچہ وچہ نہیں چاہیے“ اور ساس مسکراتی ہے۔

شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں جب آئین گاؤں آیا اور اُس کی ماں،

نے اسے خوش ہو کر بتایا کہ بانو اب کنوئیں پر پانی بھرنے نہیں جاتی تو امین کو بہت برا لگا۔ "کیوں؟ کیوں نہیں جاتی؟ میں بانو سے اس لئے تو شادی نہیں کر رہا ہوں کہ اُس کا باپ میرے ابا کا دوست ہے یا انہیں اگلی فصل تک کہیں سے گندم خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں تو اس لئے شادی کر رہا ہوں کہ وہ ایک سادہ دیہاتی لڑکی ہے اور وہ ۔۔۔"

وہ ماں کو یہ کیسے بتاتا کہ ۔۔۔ "وہ دوپہر کو بھرے ہوئے گھڑے رکھ کر جب چلتی ہے تو اُس کے جسم کے تمام خطوط جاگ اُٹھتے ہیں۔ وہ دوپہر کو اپنے باپ کے لئے کھانا لے جاتی ہے اور آس پاس کوئی نظر نہ آئے تو ہولے ہولے ماہیا گنگنانے لگتی ہے اور جب اُس کا باپ کھانا کھا رہا ہوتا ہے تو وہ گوپھیا گھما کر غلّہ پھینکتے ہوئے "ہا ہا، ہہا ہہا، ہو وو ووو۔۔۔" کی آوازیں لگاتی ہے اور یوں باجرے کی فصل پر سے چڑیاں اُڑاتی ہے، گھاس کے بڑے بڑے گٹھے اُٹھا لاتی ہے، گائیوں کے آگے چارہ ڈالتی ہے اور جب گائیں موقع پا کر اُس کی پیٹھ کو چاٹتی ہیں تو وہ انہیں یوں جھڑکتی ہے جیسے پیاری سہیلیوں کو جھڑکا جاتا ہے، دہی بلوتی ہے، آستین کو کندھے تک چڑھا کر مکھن نکالتی ہے، سبزی بیچنے والی عورتوں کے ساتھ ایک ایک گاجر پر ہاتھ ہلا ہلا کر جھگڑتی ہے اور سہیلیوں کی شادی پر ایسی لڈی ناچتی ہے کہ میراثنیں کان پکڑتی ہیں۔ اس وقت وہ کتنی پیاری، کتنی اچھوتی لگتی ہے" ۔۔۔ مگر وہ

یہ سب کچھ کیسے کہتا۔

"اور ــــــ" امین صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا "اور مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگا؟" اُس کی ماں نے پوچھا تھا۔ "تمہیں میرے ہاتھ کا پراٹھا اچھا نہیں لگتا اس لیے شہر سے اپنے لئے یہ موٹی پھولی ہوئی روٹیاں اٹھا لاتے ہو، پر تمہیں بانو کا گاؤں میں کھلے بندوں پھرنا اچھا لگتا ہے۔ کیوں؟ یہ تم تو بچپن میں بھی ایسے ہی تھے۔ گھر میں دال پکتی تھی تو رو رو کر آفت کر دیتے تھے اور پھر پیاز اٹھا کر کھا لیتے تھے۔" اس کی ماں ہنسنے لگی تھی اور امین سوچتا رہ گیا تھا کہ بہت اچھا۔ ایک بار شادی ہو جائے اور میں لاہور چلا جاؤں، پھر دیکھوں گا کہ بانو پر کون قدغن لگاتا ہے۔

شادی کے دو روز بعد جب بانو کا بھائی اُسے میکے لے جانے کے لئے آیا اور بانو ریشمی چادر کا ذرا سا گھونگٹ نکال کر اپنے بھائی، سہیلیوں اور میراثنوں کے ساتھ زیور جھنجھناتی اور سلما ستارہ چمکاتی چلی گئی تو امین کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر جائے اور بانو کے گھونگھٹ کو اتنا کھینچ دے کہ اس میں سے بانو کی جھکی ہوئی لمبی آنکھیں، اٹھی ہوئی پتلی ناک، تیز کناروں والا ترشا ہوا بالائی ہونٹ اور گالوں کے تر و تازہ گلاب کی چند پتیاں بھی دکھائی نہ دے سکیں۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ نپولین کی طرح پیچھے ہاتھ باندھ کر اور سر کو ذرا سا جھکا کر وہ دیر تک ٹہلتا رہا، جیسے غیرت و حمیت کے واٹرلو پر اُس کے ضمیر کا لشکر پسپا

ہو رہا ہے۔

وہ باہر گلی میں آ گیا تو اُسے ہوا مہندی کی نشہ آور خوشبو سے ڈگمگاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر اُسے ایسا لگا جیسے گلی میں سے گزرتے ہوئے لوگ نتھنے پھلا کر لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں اور اس خوشبو کو سمیٹے لیے جا رہے ہیں جو اُس کی بانو کی ہتھیلیوں اور تلووں نے لگائی تھی۔ پھر اُسے گمان سا ہوا کہ گلی کے موڑ پر جو چند چنگاریاں سی چمک رہی ہیں یہ بانو ہی کے لباس کا سلما ستارہ ہے۔ اچانک ایک نوجوان جو گلی میں مڑ گیا تھا، پلٹ کر آیا اور سلما ستارہ اٹھا کر چلا گیا، اور امین کا جی چاہا کہ اس کا پیچھا کرے، اُسے دبوچ لے اور اس کی کلائی مروڑ کر اس کی مٹھی میں سے سلما ستارہ نوچ لے۔

بانو کے لیے کھڑکھڑاتے لٹھے کا سفید برقع بن کر آیا تو وہ دن بھر سہمی بیٹھی رہی۔ اس کی ساس جب برقعے کی آنکھوں کی مہین جالی اور ٹوپی کی باریک چنٹوں کی تعریفیں کرتی تو بانو کو یوں محسوس ہوتا جیسے قصائی بکرے کو سامنے بٹھا کر چھری کی دھار کی تعریف کر رہا ہے، خوب چیخ چیخ کر رو دینے کو اُس کا کیسا کیسا جی چاہتا رہا اور آخر جب رات کو اُسے تنہائی ملی تو وہ یوں دل کھول کر روئی جیسے اُسے اپنی بچھڑی ہوئی ماں مل گئی ہے۔ پھر جب امین آیا اور اُس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں

میں لے کر چومنا چاہا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ تو رو رہی ہے اور اتنا رو رہی ہے کہ اس کا گریبان تک بھیگ رہا ہے اور جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ کیوں رو رہی ہے تو اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ غالب کی غزل کو اگر غلط پڑھا جائے تو یقیناً رو تی ہوگی۔ مگر یہ خیال ایک کوندے کی طرح لپکا اور کوندے پل بھر ہی کو لپکتے ہیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

بچوں کی طرح سسکتی ہوئی بانو کے سر کو اپنے بائیں بازو میں تھام کر اور دائیں ہاتھ سے اس کے گالوں پر سے آنسو پونچھتے ہوئے امین نے اُسے بتایا کہ زمانہ بدل رہا ہے ——— "پہلے ہم خچروں اور اُونٹوں پر سفر کرتے تھے۔ اب ہمارے گاؤں میں سے سڑک گزرتی ہے اور اُس پر بسیں چلتی ہیں تو کیا یہ رونے کی بات ہے؟ میرے باپ دادا نے اسی گاؤں کے کھیتوں میں ہل چلایا ہے مگر اب وہ یہ کام مزارعوں سے لیتے ہیں کیا وہ اس بات پہ روئے ہیں؟ ہمارے گاؤں کے پردہ دار گھرانوں کی حویلیوں میں آج جو بیبیاں چھپی بیٹھی ہیں، ان کی دادیوں اور نانیوں نے بھی تمہاری طرح گھاس کاٹی ہے اور چڑیاں اڑائی ہیں۔ تو کیا جب اُن کے پاس دولت آ گئی تھی اور وہ پردے میں بیٹھ گئی تھیں تو روئی تھیں؟ یہاں گاؤں میں تم برقع اس لئے نہیں پہنتی تھیں کہ برقع پہن کر نہ کنوئیں پر سے پانی بھرا جا سکتا ہے نہ کھیت کھلیان کا کام ہو سکتا ہے مگر شہر میں تو تمہیں یہ کام نہیں کرنے ہوں گے

اور وہاں ہمارے مکان کے آس پاس جتنے بھی مکان ہیں، اُن میں عورتیں پردہ کرتی ہیں۔۔ رہا یہ سفید بُرقع تو وہاں لاہور میں ہم اس سے تکیئے اور میز پوش بنا لیں گے اور میں تمہیں کالے ریشم کا بُرقع سلا دوں گا، چاہے اس پر میری آدھی تنخواہ اُٹھ جائے۔"

جس روز امین اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لاہور جانے کے لیے بسوں کے اڈے کی طرف چلا تو وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اگر سفید بُرقعے کی مہین جالی بانو کی لمبی کالی آنکھوں کے خطوط کو چھپانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی تھی تو آخر کیا ہوا۔ یہی بانو جو بُرقعے میں بے ڈھنگے طریقے سے اُکھڑی اُکھڑی چل رہی ہے۔ انہیں راہوں پر ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی رہی ہے۔ پھر اگر اس کی آنکھوں کی توسیں بُرقعے کی جالی میں سے جھلک رہی ہیں تو ایسا بھی کیا۔ مگر یہ محسوس کر کے اُس کے دل میں عجیب دھکڑ سی ہوئی کہ اڈے کا ہر آدمی جیسے بانو کے بُرقعے کی جالی کو گھورے جا رہا ہے۔ اس زمانے کے لوگ تو ایسے گھاگ ہیں کہ عورت کی جھنگلیا دیکھ کر اُس کے پورے ناک نقشے کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور یہاں تو آنکھیں اپنے پورے طول و عرض کے ساتھ نمایاں تھیں۔

راستے بھر وہ بس میں مسافروں کی طرف دیکھتا رہا کہ کہیں وہ بانو کی طرف تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اُس کا سارا خون اس کے سر میں جمع ہو کر اُبلنے لگتا تھا۔ ایک بار بانو نے اپنا مہندی لگا ہاتھ بُرقعے میں سے نکال کر

اگلی سیٹ کی پشت پر رکھا تو امین کا چہرہ لال ہو گیا جیسے سب مسافر اُس کی بیوی کے ہاتھ کی باتیں کر رہے ہیں۔ اُس نے بانو سے ہاتھ چھپا لینے کو کہا تو بانو نے جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ کو یوں تیزی سے برقعے میں لے گئی جیسے اگر وہ اسے اپنے پہنچے سے الگ کر سکتی تو چلتی بس میں سے باہر پھینک دیتی۔

لاہور پہنچ کر امین کے چھوٹے سے مکان کی چار دیواری میں بانو چند روز تک بھڑکی اور پھر ٹھنڈی ہو گئی اور ادھر امین نے اپنے قریبی دوستوں کو بتایا کہ زندگی میں اصل چیز تجربہ ہے۔ "تجربہ نہ ہو تو انسان اور گدھے میں صرف یہ فرق باقی رہ جاتا ہے کہ انسان کی دو اور گدھے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ تجربہ ہی انسان کو انسان اور پھر متمدن انسان اور مہذب انسان بناتا ہے۔ اسکیمو لوگوں کو کیا پتہ کہ ٹھنڈی چھاؤں کتنی بڑی نعمت ہے۔ میں حسن کو ایک ایسی دولت سمجھتا تھا جسے خرچ کرنا چاہیئے مگر اب تجربہ ہوا ہے تو پتہ چلا ہے کہ اس دولت کی اصل جگہ گھر کا بنک ہے" آزاد خیال اور شگفتہ مزاج امین کی ان باتوں پر سب دوست ہنسے مگر یہ تضحیک کی ہنسی نہیں تھی، ان کلرکوں، ہیڈ کلرکوں اور آفس سپرنٹنڈنٹوں نے ایک ذہین نوجوان کو آزادہ روی کی لعنت کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔

جب بانو کا سیاہ ریشمی برقعہ سِل کر آیا تو بانو پر بھی یکایک انکشاف ہوا کہ وہ

ترقی کر گئی ہے۔ اس انکشاف نے یقین کی صورت اس وقت حاصل کی جب چند مہینے کے بعد وہ ایک عزیز کی شادی پر گاؤں گئی۔ بس کے اڈے پر جب وہ اپنے ریشمی بُرقعے میں طوفانی سمندر کی سی لہریں پیدا کرتی ہوئی اُتری اور جب اُس کے بعد ٹائی سوٹ میں ملبوس اس کا شوہر اُترا اور بس کی چھت پر سے اُن کی چمڑے کی اٹیچیاں اُتریں تو سب لوگ یوں دم بخود کھڑے دیکھتے رہے جیسے بس کے اڈے پر ہوائی جہاز اُتر رہا ہے۔ پھر جب شادی والے گھر میں وہ لڑکیاں اُس سے ملنے سے زیادہ اُسے دیکھنے آئیں جن کے ساتھ اس نے ماہیئے گائے تھے اور لُڈیاں ناچی تھیں اور چرخے کاتے تھے تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ان سب سے الگ اور اونچی مخلوق ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کے ناخن اچھلتے ہوئے لال رنگ کی پالش سے دہکتے ہوئے انگارے ہو رہے تھے۔ اُس کے ہونٹ تازہ زخم کی طرح بھیگے بھیگے اور گہرے سُرخ تھے۔ کاجل کی لکیر اُس کی لمبی آنکھوں کو کنپٹیوں تک کھینچ لے گئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ننھا سا رومال تھا اور وہ رنگین ریشمی لباس میں یوں کسی ہوئی تھی کہ اس کی ناف کا دائرہ تک نظر آ رہا تھا۔ دوسری عورتیں گاتی ہوئی میراثنوں کو پیسہ پیسہ دیتی تھیں مگر بانو گردن کے نیچے جمپر کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چونیاں اٹھنیاں نکال لاتی تھی اور جب مامنی کی ہمجولیوں نے اُس سے لاہور کا پوچھا تو وہ اتنے بڑے بڑے اور بہت سے جھوٹ بولی کہ ساری

عمر نہیں بولی تھی۔ پھر جب وہ برقع اوڑھ کر اٹھی اور دوہری نقاب کو سر پر الٹ کر اس نے سنہری سینڈل پہنی اور مسکرا کر رخصت ہوئی تو عورتیں دیر تک اس بھینی بھینی خوشبو کو سونگھتی رہیں جو بانو کا سر سراتا ہوا برقع بکھیر گیا تھا۔

اب بانو کا برقع، نیل پالش اور لپ سٹک کی طرح اس کے سامان آرائش کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ جب بھی وہ ہر مہینے کی یکم کی شام کو، پڑوسنوں کی ٹولی میں شامل ہو کر شاپنگ کو جاتی تو واپس آ کر دیر تک برقعے کی استری کرتی رہتی۔ امین دگنی تنخواہ پہ ایک اور فرم میں چلا گیا تھا اس لیے ایک کوٹھی کی انکیسی کرائے پہ لے لی تھی۔ اس نے بانو کو ایک نوکرانی بھی رکھ دی تھی خود ایک سکوٹر بھی خرید لیا تھا۔ اور ڈریسنگ گاؤن بھی پہننے لگا تھا۔ اس کی بیٹھک میں صوفہ سیٹ اور شیشے کی تپائیاں بھی آگئی تھیں ہفتے عشرے میں ایک آدھ بار وہ اپنے دفتری دوستوں کو دعوت پہ بھی بلانے لگا تھا۔ اب اس کے دوستوں کا طبقہ بھی بدل گیا تھا۔ ان دوستوں میں کئی ایسے بھی تھے جن کی بیویاں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ بھی دعوتوں میں شریک ہوتی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اندر جا کر بانو کی مزاج پرسی کر لیتی تھیں مگر ان کا زیادہ وقت مردوں کے درمیان ہی گزرتا تھا۔ وہ عالمی سیاست سے

لے کر عورتوں کے پردے، گوبھی کے بھاؤ اور مرچوں میں ملاوٹ تک کے موضوعات پر باتیں کرتی تھیں۔ بعض دعوتوں میں فرموں کے بڑے بڑے اہلکار بھی موجود ہوتے تھے اور اُن کی بیگموں کے ساتھ چھوٹے اہل کاروں کی بیویاں یوں گھل مل جاتی تھیں جیسے ساتھ کھیلی سہیلیاں ہیں۔ پھر امین کو یکایک معلوم ہوتا تھا کہ فلاں کو ایک دم ترقی مل گئی ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ اُس کی بیوی اور "باس" کی بیگم کے درمیان بہناپے کا رشتہ پیدا ہو گیا ہے اور عیدالفطر کے موقع پر آپس میں سوئیوں کا تبادلہ تک ہوا تھا۔

"غلط بات ہے۔" امین کہتا تھا "یہ تو بالکل ایسی ہی بے غیرتی ہے جیسے میں اپنے باس کو دعوت پر بلاؤں اور اپنی بیوی سے کہوں کہ صاحب کے منہ میں نوالے ڈالو۔ نہیں حضور۔ یہ ہم سے نہیں ہوگا۔ ہم دیہاتی لوگ اگر ایسی باتیں سوچیں تو دماغ کی دھجیاں اُڑ جائیں۔ توبہ ہے بھئی۔ حد ہو گئی بے حیائی کی۔"

کتنے ہی اہلکار اپنی بیویوں کو اپنی ترقی کی سیڑھیاں بنا کر بلندی کی طرف لپکے جا رہے تھے اور امین مہینوں کی منزلیں برسوں میں طے کر رہا تھا۔ چند جونیئر لوگ جو فرم کے ساتھ اس سے کہیں بعد میں منسلک ہوئے تھے اب اُس کے افسروں میں شامل تھے۔ اس کے باوجود وہ صابر اور قانع نظر آتا تھا۔ ہر سال دفتری قواعد کے مطابق اس کی تنخواہ بڑھ

جاتی تھی اور اسی لئے چند سال کے بعد وہ بھی ایک ایسے عہدے پر پہنچ گیا
کہ ٹیکسی چھوڑ کر چھوٹے سے بنگلے میں آ گیا۔ سکوٹر بیچ کر ننھی سی کار خرید لی
اور ایک دن میں دو بار شیو بنانے لگا۔

اس دوران میں بانو کے ہاں تین بچے پیدا ہوئے۔ بڑا بچہ ایک کانونٹ سکول میں داخل ہو کر گڈ مارننگ اور ٹماٹر ٹماٹر بولنے لگا تھا اور بانو اپنے بچوں کو ایسی کہانیاں سنانے لگی تھی جن میں پریاں کیک کھاتی ہیں۔ ہائیڈ پارک کے پھولوں میں محل بناتی ہیں۔ شہزادوں پہ فدا ہو کر ان کا پیچھا کرتی ہیں تو لندن سے اُڑ کر پیرس، یہ بن یا زیادہ سے زیادہ استنبول تک جاتی ہیں اور "ڈوڈوڈل ڈو" قسم کے گیت گاتی ہیں۔ دراصل شادی کے فوراً بعد سے آمین نے بانو کو تعلیم دینا شروع کر دی تھی اور اس تعلیم کی بسم اللہ "اے، بی، سی" سے ہوئی تھی اور اب جب کہ وہ بنگلے میں رہتے تھے اور کار میں ڈاک کو نکلتے تھے اور بیڈ ٹی پیتے تھے اور حیران یا خوش ہوتے تھے تو "گڈ گاڈ" کہتے تھے، بانو پریوں کی کہانیوں کی کتابیں خوب روانی سے پڑھ لیتی تھی اور ملنے والیوں کو یہ نہیں بتاتی تھی کہ وہ ایک "فارمر" کی بیٹی ہے، بلکہ کہتی تھی وہ "ڈیڈی ہمیشہ آئزن ہاور کی طرح اپنے فارم پہ ہی رہنا لائک کرتے ہیں۔"

اس کے باوجود پردہ اُس کے ایمان کا ایک جزو بن کر رہ گیا تھا جب ڈرائینگ روم میں قہقہے اس انتہا کو جا پہنچتے تھے، جب ہنستے اور رونے

میں کوئی فرق نہیں رہتا، تو جب بھی وہ بچوں اور نوکروں نوکرانیوں سے یوں آہستہ آہستہ بولتی تھی جیسے ساری دنیا نے اس کی آواز پر کان لگا رکھے ہیں۔ دعوت کے موقع پر ایپن جب کبھی ڈائننگ روم سے گیلری میں آکر پکارتا تھا۔ "بانیا ڈارلنگ۔ میرے شیلف پر سگریٹ رکھے ہیں وہ بھجوا دو پلیز" تو بعد میں بانو اسے سخت سست کہتی تھی کہ پردہ دار بیویوں کو یوں نام لے کر نہیں پکارتے اور ایپن قہقہہ مار کر کہتا تھا "وہ تو میں جانتا ہوں مگر تمہارا نام لے کر اس لئے پکارتا ہوں کہ میرے دوست یہ نہ سمجھیں کہ میں بے چارا رنڈوا ہوں۔"

ایپن جب فرم کے دفتر کے سامنے اپنی کار روکتا تھا تو دوسرے اعلیٰ افسروں کی کاروں کے مقابلے میں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ڈبیا میں سے نکلا ہے۔ پھر جب اپنے کمرے سے اٹھ کر کسی ایسے اہلکار کے سامنے فائلیں پیش کرنے جاتا تھا جو کسی زمانے میں اس کے سامنے فائلیں پیش کرنے آیا کرتا تھا، تو اس کی زبان کی جڑ میں کونین کی گولی سی گھل جاتی تھی۔ پھر لمبی چوڑی میزوں کی موٹے شیشے والی سطح پر جب مقابل کا عکس یوں پڑتا تھا، جیسے وہ دستخط کرنے کی بجائے جھیل میں جھانک رہا ہے تو کھولتا ہوا خون اس کی کنپٹیوں میں ٹھکیاں لینے لگتا تھا۔ دفتر کا وقت ختم ہوتا تو پوری کوشش کرتا کہ سب سے آخر میں نکلے کیونکہ ایک بار جب

اُس سے اپنی کار سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی تو ایک دوست نے یہ کہہ کر چپراسیوں تک کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں پیدا کر دی تھیں کہ "امین۔ آؤ میری کار میں بیٹھ جاؤ اور اپنی کار کو میری کار کی ڈگی میں رکھ دو۔"

امین احساسِ کمتری کو چھپانے کے لئے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ اپنے اعلیٰ افسروں کی دعوتیں کرے اور انہیں قسم قسم کے کھانے کھلائے اور اُن کے کھوکھلے لطیفوں پہ چیخ چیخ کر ہنسے۔۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا مگر کبھی کبھی کسی افسر سے اشارہ پا کر وہ شراب کا انتظام کر دیتا تھا۔ اس نے سروس میں آئے ہوئے افسروں سے اس قسم کی باتیں بھی سنی تھیں کہ "امین۔ کبھی بھابھی سے بھی ہمیں انٹروڈیوس کراؤ نا۔ کب کراؤ گے؟ جلدی سے کرادو ورنہ کسی روز ہم خود اندر جا کر کرالیں گے۔" ایک دو بار تو اس نے نشے میں دُھت اپنے باس کو گیلری میں کھڑے ہو کر "بھابھی۔ او رجابھی ڈیر" پکارنے سے بھی روکا اور جب باس نے کہا: "کیوں؟ تم ہماری مسز کو دیکھو، ہم تمہاری مسز کو نہ دیکھیں!" تو کچھ تلخی بھی پیدا ہو گئی تھی مگر دوسرے ہی روز اس نے دفتر جا کر پہلا کام یہ کیا تھا کہ باس سے معافی مانگ لی تھی۔

انہیں دنوں فرم کے ایک جونیئر افسر کی شادی ہوئی اور اس نے دعوتوں کا تانتا باندھ دیا۔ اُس کی بیوی، چکنے جسم کی نوجوان لڑکی تھی۔ الف اے پاس تھی اور انگریزی کا فقرہ بار بار "یو سی" کہے بغیر بول لیتی تھی۔

چند ہی مہینے میں یہ اہلکار ترقی کر کے امین کے سر پہ آ دھمکا ۔ "سر، سر" کی رٹ لگائے رکھنے والے نے جس روز اسے "مسٹر امین" کے الفاظ سے مخاطب کیا تو ایک لمحے کے لئے امین بُت سا بن کر رہ گیا ۔ پھر اُس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بولا ۔ "سر آپ کی ترقی کی خوشی میں کل شام میں نے ایک چھوٹی سی ڈرنک پارٹی کا انتظام کیا ہے ۔ کیا آپ اور بیگم صاحبہ تشریف لا سکیں گے ؟"

دوسرے روز شام کو جب مہمان جمع ہوئے اور تپائیوں پہ گلاس رکھے گئے اور امین نے وائٹ ہارس کی توندیلی بوتل کھول کر حسب معمول ساقی گری شروع کی تو خاص مہمان نے پوچھا ۔ "یہ پگ کس کے لئے ہے ؟"

"میرے لئے" امین نے جواب دیا ۔

سب لوگ سانسیں روک کر رہ گئے ۔ صرف خواتین ذرا سا گنگنائیں ۔

"خوش ہو کر سب پینے ۔ یہ نہیں"

"کیوں نہیں ؟" امین نے گلاس کو پیشہ ور شراب نوشوں کی طرح سر تک بلند لے جا کر کہا ۔

"ہُرّا !" سب چلّا اُٹھے ۔

اور تین کمرے اُدھر نوکر دن نوکرانیوں کو ہدایت دیتی ہوئی بانو چونکی ۔ کچھ دیر تک وہ بوہیں سمیٹ کر گیلری میں کھلنے والے دروازے

کی طرف دیکھتی رہی اور پھر یکایک نوکروں پر خفا ہونے لگی۔

کچھ وقفے کے بعد بانو کو ایسا لگا جیسے وہ کوٹھی کی بجائے مچھلی منڈی میں بیٹھی ہے۔ ڈرائینگ روم میں سے اٹھتا ہوا شور اتنا مسلسل اور اتنا بلند تھا جیسے یہ سارا ہنگامہ گیلری میں ہو رہا ہے۔ اتنے لمبے قہقہے کہ آخر میں کراہیں بن جاتے تھے، اتنے اونچے نعرے جیسے چیخیں بلند ہو رہی ہوں اور عورتوں کی ہنسی میں تو چھری کی سی دھار تھی۔ اس نے گھبرا کر بچوں کے کمرے کی طرف دیکھا مگر دروازہ بند تھا۔ اسے سامنے کھڑے ہوئے بیرے سے شرم سی آنے لگی۔

"صاحب کو بلاؤ" اس نے بیرے سے کہا۔

بیرا گیا۔ واپس آیا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

"صاحب کو بلایا؟" بانو نے بیرے کا فق چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

"جی صاحب تو ۔۔۔۔" وہ پلکیں جھپکنے اور ہاتھ مروڑنے لگا۔

ایک لمحے کے بعد خود بانو کا چہرہ بھی فق ہو گیا۔ اس نے گیلری میں کھلتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور خوف زدہ ہو کر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔

امین کی رہنمائی میں اس کے دوستوں اور ان کی بیگموں کا ریلا اندر آ گیا۔ بیگموں کی ریشمی ساریوں کے پلو ان کے شانوں سے گر کر نیچے گھسٹ رہے

تھے اور اُن کی بلاوزوں کے زیریں حاشیے بہت اُوپر اُٹھ گئے تھے۔ وہ مسلسل ہنس رہی تھیں۔ آتے ہی وہ بچوں کے کمرے اور باتھ روم کے دروازوں پر چوکیداروں کی طرح جا کھڑی ہوئیں اور بانو جس کے لئے بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے: دیوار سے چمٹ کر رہ گئی تھی اور اُس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

سب اپنے جسم کا توازن قائم رکھنے کی کوشش میں جھوم رہے تھے اور یوں پاؤں پھیلائے کھڑے تھے جیسے اُن کی ٹانگوں کے درمیان سے نالی گزر رہی ہے۔ امین کا تو یہ عالم تھا جیسے جمناسٹک کھیل رہا ہے۔

انتہائی نشے میں امین کی زبان تالو سے لگنا اور دانتوں کو چھونا بھول گئی تھی اور وہیں اپنی جڑ کے پاس گھوم پھر کر رہ جاتی تھی۔ اسی لئے الفاظ اُس کے منہ میں سے گیندوں سی بن کر گولائی میں نکل رہے تھے۔ اُس نے بانو کی طرف پورا بازو اُٹھایا اور بولا "یہ ہماری بیگم ہیں۔ یہ مسز امین ہیں مسز بانو امین مسز بانیا امین، ہیلو بانیا ڈارلنگ۔ میٹ مائی ڈیئر ڈیئر ڈیئر فرینڈز اینڈ ویری بیوٹی فل وائوز۔ کم آن —— او کم آن —— "

مہمان قہقہے مارنے لگے۔ اُن کی بیویوں کو ہنسی کا ہسٹریا ہو گیا اور امین کرسیوں اور الماریوں کا سہارا لیتا، تپائیوں پر سے گلدان اور تصویریں گراتا، بانو کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اُس نے مہمانوں کی طرف

یوں دیکھا جیسے مداری ٹوپی میں سے کبوتر نکالنے سے پہلے تماشائیوں کو دیکھتا ہے۔ اُس کی چڑھی ہوئی پتلیاں اور اوپر چڑھ گئیں۔ دونوں ہونٹوں کو دانتوں میں دبایا۔ ایک جھٹکے سے بانو کا دوپٹہ نوچا اور اُسے فرش پر زور سے پٹخنے کی کوشش میں پرلی طرف تپائی پر جا گرا۔

دوپٹہ کھینچنے سے بانو کے لمبے بال اُس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔ وہ چیخ کر بیٹھی۔ ایک ہاتھ سے بال ہٹا کر اُس نے ایبن کو دیکھا اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ یوں سمٹ کر بیٹھ گئی جیسے دوپٹہ اُترنے سے اس کا سارا جسم ننگا ہو گیا ہے۔

مگر دوپٹہ اُترنے اور چہرے پر سے بالوں کے ہٹنے کے مختصر سے وقفے میں مہمانوں پر نشے کی ایک اور لہر گزر گئی اور وہ داد دینے لگے۔ "اوہ! اوہ! گڈ لارڈ، اے ماسٹر پیس! مس انگر ڈبر گمین آف لاہور! ونڈر فل! ایکسکویزٹ! بیوٹی انکارنیٹ! مسز ہملٹن آف ٹوینٹیتھ سنچری!"

"تھینک یو تھینک یو ویری مچ" ایبن نے داد وصول کی، اور جابیگیات نے اُسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

بانو کا گٹھڑی بنا ہوا جسم یوں بل رہا تھا جیسے بار بار کوئی اُس کی پسلیوں میں کچوکے دے رہا ہے۔

"دوست بانیا" ایبن اس کے پاس گھٹنوں کے بل گر کر پکارا۔

"ایکسکیوزمی ڈارلنگ۔ میں شادی کے بعد سے تم پر زبردستی کررہا ہوں میں اس زبردستی کی معافی مانگتا ہوں۔ میں گنہ گار ہوں، میں مجرم ہوں، میں حرام زادہ ہوں۔ مجھے معاف کردو بانیا آج سے تمہارا پردہ ختم۔ بائی گاڈ آج سے، ابھی سے ختم، میرا خدا میرا گواہ ہے، میرے افسر میرے گواہ ہیں، میرے افسروں کی بیگمیں میری گواہ ہیں۔ آپ سب لوگ گواہ ہیں نا؟"

عورتوں مردوں نے اثبات کا نعرہ مارا۔

"لو اب تو خوش ہو جاؤ بانیا ڈارلنگ" پھر نہ جانے کیا ہوا کہ امین کی آواز بھرّا گئی۔ اُس کے چہرے پر تشنج کی کیفیت چھا گئی۔ وہ رونے بھی لگا اور ہنسنے بھی لگا اور کہنے لگا "اسی خوشی میں میں نے شراب پی ہے تم بھی شراب پیو۔ میرے کو بھی پلاؤ۔ ساری دنیا کو پلاؤ۔ میرے افسروں سے ہاتھ ملاؤ، میرے افسروں کو ٹانگ دکھاؤ۔ میرے افسروں کو خوش کرو، بانیا ڈارلنگ اوہ بانیا ڈارلنگ ـــــ"

اور امین سمٹی ہوئی بانو کے قدموں پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے اور ہنسنے لگا۔

مارچ ۱۹۶۲ء

ایک
[illegible]